منتخب اردو سفر نامے پر مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

عائشہ خضر

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر 2023ء

منتخب اردو سفر نامے پر مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

عائشہ خضر

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر 2023ء

©عائشہ خضر

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: منتخب اردو سفر نامے پر مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: عائشہ خضر رجسٹریشن نمبر:۔ 23/M/U/F20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر ارشاد بیگم _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں ، عائشہ خضر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ارشاد بیگم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

عائشہ خضر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر 2023ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہار تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	1
(الف) تمہید:	
i۔ موضوع کا تعارف	1
ii۔ بیان مسئلہ	2
iii۔ مقاصد تحقیق	2
iv۔ تحقیقی سوالات	2
v۔ نظری دائرہ کار	3
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	3
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	4
viii۔ تحدید	5
ix۔ پس منظری مطالعہ	5
x۔ تحقیق کی اہمیت	6
(ب) تاریخ اور تہذیب کے مباحث کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	6
ا۔ تاریخ کیا ہے	6
۲۔ فلسفہ تاریخ	10

۳۔ تاریخ کی ضرورت واہمیت 19

۴۔ تہذیب کیا ہے 21

۵۔ تہذیب اور ثقافت کا فرق 25

(ج) مصری تاریخ و تہذیب 29

(د) ادب اور تاریخ و تہذیب کا باہمی ربط 39

(ہ) اُردو سفر نامے میں تاریخ و تہذیب سرسری مطالعہ 44

حوالہ جات 53

باب دوم: اُردو سفر ناموں پر مصری تاریخ کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ 55

۱۔ واقعاتِ فراعنہ 58

۲۔ بادشاہی نظام 60

۳۔ انبیاء اور صحابہ کے واقعات 62

۴۔ فراعنہ کے عقائد 72

۵۔ تاریخی مزارات 75

۶۔ جامعہ الازھر 81

۷۔ دریائے نیل اور منسوب واقعات 86

۸۔ عجائب گھر 91

۹۔ مذہبی عبادت گاہیں 99

۱۰۔ تاریخی شہر 103

۱۱۔ دیگر مشہور مقامات 105

حوالہ جات 107

باب سوم: اُردو سفر ناموں پر مصری تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ 110

مصری تہذیب کا اجمالی جائزہ:

۱۔ مصری مہمان نوازی 112

۲۔ حنوط کے طریقے	114
۳۔ تعمیرات	118
۴۔ مصری ممیاں	121
۵۔ فراعنہ کا مذہب	124
۶۔ مصری رہن سہن	130
۷۔ حسنِ مصر	135
۸۔ فراعنہ کا لباس	140
۹۔ مصری درس گاہیں	143
حوالہ جات	146
ماحصل	148
(الف) مجموعی جائزہ	151
(ب) نتائج	155
(ج) سفارشات	156
کتابیات	157

ABSTRACT

Title: An analytical study of the influence of Egyptian history and civilization on selected Urdu travelogue

The travelogue has a high literary quality as it has great educational, informative and social values. It has deep connection with history and civilization. A travel writer explores new destinations and describes the history, civilization, culture, ethics, law, technology, religion, art, literature and geography of that particular place from his perspective. Therefore, in this genre of literature, the traveler's aspect directly interacts with history and civilizations. This thesis "An Analytical Study of the influence of Egyptian History and Civilization on Selected Urdu Travelogues" is truly unique as its subject and content discuss ancient Egyptian history and civilization through Urdu travelogues. During the journey, Egyptian history and civilization have been discussed with the help of various archeological sites. The influence of history and culture in Urdu travelogues can be seen regularly in the middle of the 19th century when the body of Pharaoh was exhumed, which revealed the ancient history of Egypt once again in Urdu travelogues. The effects of World War II in the mid-20th century can be seen in travelogues everywhere in the world. For this reason, the historical style has also been adopted. An analysis of Egyptian history and culture has been presented in this research. This discussion is completed in the first chapter. In the second and third chapters, an attempt is made to show how the travel writers treat history and civilization in their travelogues and also make recommendations for further study

اظہارِ تشکّر

اُس خالق کائنات کی حمد و ثنا کہ جس نے اس ارضی و سماوی دنیا میں بطور انسان تخلیق کیا اور شعور سے نوازا۔ اللہ کا لاکھ شکر کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں آج اپنا ایم فل کا مقالہ مکمل کرنے کے قابل ہو سکی۔ تحقیق ایک دقیق کام ہے اور پختہ ارادے وہمت کی ضرورت کا ہونا بھی لازم ٹھہرتا ہے۔ تحقیق کا ماحول اور مناسب وسائل کا ہونا تحقیق کے لیے انتہائی ضروری ہے تبھی یہ کسی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز شعبہ اردو کے قابل قدر اساتذہ کا بے حد شکریہ کہ انھوں نے تحقیق کے پیچ و خم سے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا۔ شعبے کے تمام اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر رانا محمود الحسن، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر نازیہ یونس، کا شکریہ کہ جن کی رہنمائی سے یہ مرحلہ بھی آسان ہوا۔

نگران مقالہ ڈاکٹر اِرشاد بیگم کی قدم قدم پر رہنمائی اور حوصلہ باعث تکمیل مقالہ ہے۔ دوران تحقیق جس لگن اور محنت سے انھوں نے ساتھ دیا اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔

میرے "محسن" جن کا شُکریہ کرنا ان کے احسان کی توہین ہو گی۔ ان کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انھوں نے اِس دقیق کام میں میرا ساتھ دیا اُن کا تعاون اور حوصلہ افزائی قدم قدم پر مجھے تحقیق کی نئی راہیں دکھاتی رہی میں تادمِ آخر اُن کی شکر گزار رہوں گی۔ فیملی کے تعاون کا بھی شکریہ۔ اللہ رب العزت سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

عائشہ خضر

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

1. موضوع کا تعارف:

انسان کے اس کائنات میں آنے کے بعد سے تاریخ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ تاریخ مرتب ہونا شروع ہوئی۔ انسان نے جو ماحول قائم کیا وہاں اس نے کچھ خاص طرز زندگی کو اپنایا اور آنے والے ادوار کے لیے کچھ راہوں کا تعین کیا۔ جس خاص فکر اور طرز زندگی کو اپنایا گیا اسے تہذیب سے موسوم کیا جانے لگا۔ یہی تہذیب اور ماحول میں ہونے والے واقعات تاریخ کا بھی حصہ بنے اور تاریخ مرتب ہونے لگی۔ جہاں انسان کے اس سرزمین پہ آنے سے تاریخ و تہذیب کا آغاز ہوا وہیں انسان کی خوراک و رہائش کے حصول کے لیے سفر بھی ناگزیر ٹھہرا۔

ابتدائی ادوار میں سفر زیادہ طویل نہ ہوتے تھے اور نہ ہی سفر کی یادوں کو محفوظ کرنے کا کوئی ذریعہ تھا۔ زبانی کلامی ہی سفر کی یاداشتیں بیان ہوتی تھیں اور انھی کو مشعل راہ بنا کر باقی سفر کرنے والے رہنمائی لیتے تھے۔ جوں جوں انسانی تاریخ و تہذیب کا ارتقا ہوتا گیا چیزوں کو بہتر طور سے محفوظ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بحری بیڑوں پر سفر کرنے والے کچھ نقشوں کے ذریعے راستوں کا تعین اور حالات و واقعات سے دوسروں کی رہنمائی کا باعث بنے اور جس خطے کے متعلق معلومات فراہم کرنا ہوتی تھیں کی جاتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سفر کو محفوظ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے انسان نے تحریری طریقہ ایجاد کیا۔ مختلف زبانوں میں سفر نامے تحریر ہونے لگے۔

اردو میں "عجائبات فرہنگ" یوسف حسن کمبل پوش نے پیش کیا۔ اس کے بعد اس زبان سے وابستہ افراد نے جس خطے کے سفر کیے اسے یاداشت کے طور پر تحریر کیا اور اسے ادبی صنف کی حیثیت بخشی۔ ایسے ہی مصر جو قدیم تاریخ و تہذیب کا حامل خطہ ہے دوسرے خطوں سے آئے افراد کے لیے باعث پرکشش ٹھہرا۔ مصر کی قدیم تاریخ اور تہذیب دور حاضر میں علم کے پیروکاروں کے لیے علمی شاخ کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اس خطے کے متعلق ہر تخلیق کار اور علم کے ماہر نے اس حسین خطے کو دنیا سے روشناس کرانے کی سعی کی۔اردو میں بھی مصر کے سفر کرنے والوں نے اپنی حسین یادیں اور خطے کی تاریخ و تہذیب کو سفر نامے کی صورت میں ادبی قارئین کے لیے پیش کیا۔ مجوزہ موضوع اسی تناظر میں ہے۔ جس میں مصری تاریخ و تہذیب کے اردو سفر ناموں پر اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

2: بیان مسئلہ:

مصر ایک قدیم تاریخ اور تہذیب کا نمائندہ خطہ ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تاریخ اور تہذیب رکھنے والے خطوں میں مصر کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ تاریخ کے ساتھ بھی زیادتی تصور ہو گی۔اس لیے دور حاضر میں مصر کے متعلق معلومات کو یکجا کرنے اور اس کی قدیم تصویر کو سامنے لانے کے لیے تگ و دو جاری ہے۔ یہی وجہ ہے اب مصر کا خطہ اپنی اس قدیم تاریخ و تہذیب کی وجہ سے باقاعدہ علم کی شاخ (مصریات) کے طور جانا جانے لگا ہے۔اردو سفر ناموں میں بھی مصری تاریخ و تہذیب کی بڑی اہمیت ہے۔ادب میں تاریخ و تہذیب کا بیان پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا بیان ہوتا ہے اور اگر کوئی آنکھوں دیکھا حال بیان کرے تو اسے چار چاند لگ جاتے ہیں۔اردو سفر نامے میں بیش قیمتی اثاثہ مصریات پہ مشتمل ہے جس پہ تاحال ادب میں کوئی تحقیقی پیش رفت نہیں ہوئی۔اس لیے ضروری ہے کہ اردو سفر نامے پر مصری تاریخ و تہذیب نے جو اثرات مرتب کیے ان کا مطالعہ کیا جائے۔اسی کے پیش نظر مجوزہ موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔

3-مقاصدِ تحقیق:

۱۔ منتخب سفر ناموں میں مصری تاریخ کے بیان کا تجزیہ کرنا۔

۲۔ مصر کی تہذیب اور اس کے اردو سفر نامے پر اثرات کا مطالعہ کرنا۔

4- تحقیقی سوالات:

۱۔ اُردو سفر ناموں میں مصری تاریخ کی تخصیص کیا ہے؟

۲۔ مصری تہذیب نے اُردو سفر نامے پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟

5۔ نظری دائرہ کار:

اردو ادب میں تاریخ و تہذیب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً تمام صنف ادب میں تاریخ و تہذیب کو برتنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ سفر نامہ ایک ایسی ہی صنف ادب ہے جس میں تاریخ و تہذیب کا بیان شامل نہ ہو تو اسے سفر نامہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس بھی خطے کے سفر کو تحریری صورت دے اس کی تاریخ و تہذیب اور سیاسی و معاشی حالات کا تذکرہ کرے۔ اس اعتبار سے تاریخ و تہذیب سفر ناموں کی اہم خصوصیت تصور کیے جاتے ہیں۔ مصر کی تاریخ و تہذیب قدیم ہونے کی بنا دنیا بھر کے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ اسی مقبولیت کی وجہ سے اب یہ ایک علمی شعبے کی شکل میں واضح ہو رہی ہے جس کو مصریات کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اِسے "Egyptology" کہا جاتا ہے۔ جدید دور میں "Egypotology" ایک الگ شعبے کے طور پر اپنی پہچان بنا رہی ہے۔ "A History of World Egypotology" میں "Andrew bednarski" لکھتے ہیں:

"Egyptology is the study of the Ancient culture, history and archeology of Geographical area now recognised as the modern state of Arab Republic of Egypt....." Page no: ۱۰

مصری تاریخ و تہذیب کو اردو سفر ناموں میں خاص طور پر برتا گیا ہے۔ مجوزہ موضوع کا مطالعہ اینڈریو بیڈنارسکی کی کتاب "A History of World Egypotology" کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ اور تہذیب کے مباحث کے لیے ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب "تاریخ اور فلسفہ تاریخ"، سبط حسن کی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقا"، سید عابد حسین کی کتاب "قومی تہذیب کا مسلہ" کے علاوہ دیگر تاریخی اور تہذیبی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

6۔ تحقیقی طریق کار:

مجوزہ تحقیقی مقالے کا موضوع "اردو سفر نامے پر مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ" ہے۔ جس کے تحت تاریخ و تہذیب کے بنیادی مباحث کا مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے اور اردو سفر ناموں میں تاریخ و تہذیب کے حوالے سے ایک طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد منتخب سفر ناموں میں مصری تاریخ

و تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ لہذا اس تحقیق کے لیے دستاویزی اور تجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔

اِس تحقیق کے دوران معلومات، تصورات و نظریات کو پرکھ کر اور شواہد کو جمع کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تحقیق کے دوران سفر نامہ نگاروں کے متعلق ادبی جریدوں میں شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور منتخب سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے ماہ قبل مقالہ جات وغیرہ تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔

7۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اردو ادب میں سفر نامے کے حوالے سے روایتی نوعیت کا تحقیقی سطح پر کام ہوا ہے۔ سفر نامہ کی صنف میں انفرادی سطح پر بھی تحقیقی کام مل جاتا ہے۔ لیکن سفر نامے کی روایت، تہذیبی مطالعہ اور تنقیدی نوعیت کے سوا کوئی خاص تحقیقی کام نظر نہیں آتا۔ بالخصوص جس زاویے سے منتخب سفر ناموں پہ کام کیا جا رہا اس نوعیت کا جامعات کی سطح پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ منتخب سفر نامہ نگاروں کے یہاں مصری تاریخ و تہذیب کے خاص پہلو کو پرکھنا اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔ مصری تاریخ و تہذیب مختلف کتب اور مضامین کی صورت میں موجود ہے۔ سفر ناموں میں بھی مصر کی تاریخ و تہذیب کے واضح عکس ملتے ہیں جن پہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جس زاویے کے تحت مجوزہ موضوع میں سفر ناموں کو پرکھا جانا ہے اس لحاظ سے یہ تحقیقی سطح پہ ایک نیا اضافہ ہوا ہے۔ اردو سفر ناموں میں مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور نیا کام ہے۔ موضوع کے قریب قریب جو کام ہوئے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ اُردو سفر نامے میں تہذیبی شعور، شازیہ ارم، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء (غیر مطبوعہ)

۲۔ اُردو سفر نامے میں مذہبی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ (۱۹۴۷ء-۲۰۰۰ء) عائشہ بیگم، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، س ن) غیر مطبوعہ)

۳۔ یعقوب نظامی: بطور سفر نامہ نگار، انیسہ خالد، لاہور کالج فار ویمن، ۲۰۱۵ء) غیر مطبوعہ)

۴۔یعقوب نظامی کے سفر ناموں میں سماجی شعور، سعدیہ جان، ہزارہ یونیورسٹی، ۲۰۱۵)غیر مطبوعہ)

۵۔منتخب ایشیائی اُردو سفر ناموں میں تاریخی عناصر: تحقیق و تنقید،(غیر مطبوعہ)نجابت حسین ،اسلامک یونیورسٹی، ۲۰۲۲

8۔ تحدید:

یوں تو اردو سفر نامہ مصری تاریخ و تہذیب کے حوالے سے ایک بڑی فکر سموئے ہوئے ہے۔ اردو ادب میں سفر نامہ نگاروں نے اس پہلو کو اپنے سفر ناموں میں سمونے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ جن پر انفرادی سطح پر کام کیا جا سکتا ہے اور کچھ سفر ناموں پر انفرادی سطح پر اس حوالے سے کام ہوا بھی ہے۔تاہم مجوزہ تحقیقی موضوع میں جن منتخب سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کا مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ایسے سفر نامہ نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے جنہوں نے بالخصوص مصری تاریخ و تہذیب کو اپنے سفر ناموں میں جگہ دی ہے۔منتخب سفر نامہ نگاروں کے تمام سفر نامے اس موضوع کا حصہ نہیں ہیں بلکہ ایسے سفر ناموں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں خاص طور پر مصری تاریخ و تہذیب نمایاں ہے یا سفر نامہ خالصتا مصر کے سفر پہ محیط ہے۔ان میں یعقوب نظامی کا سفر نامہ "مصر کا بازار"، محمد سعید جاوید کا سفر نامہ "مصریات"،ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا سفر نامہ "حُسنِ مصر"، محمد رفیق ڈوگر کا"اور نیل بہتا رہا "اور ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا"نیل کے سنگ"شامل ہیں۔

9۔پس منظری مطالعہ:

مجوزہ موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے جن کتب کا مطالعہ کیا ہے ان میں بنیادی ماخذ سر فہرست ہیں۔تاریخ کے لیے ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب "تاریخ اور فلسفہ تاریخ"کا مطالعہ شامل ہے۔سفر نامہ اور تاریخ کی روایت کو سمجھنے کے لیے "اردو ادب میں سفر نامہ "ڈاکٹر انور سدید،ابن حنیف کی کتاب ''مصر کا قدیم ادب'' اور ''مصر کی قدیم تاریخ''کا مطالعہ کیا گیا۔اس کے علاوہ بنیادی مباحث کے لیے دیگر تاریخی و تہذیبی کتب کا سرسری مطالعہ بھی شامل ہے"Andrew Bednarski کی کتاب" A History of

world Egyptology"اور انجنیئر محمد فرقان سنبھلی کی کتاب "مصر قدیم" کو بھی اس مطالعے کا حصہ ہیں۔اس کے علاوہ موضوع کی مناسبت سے مختلف آرٹیکلز اور تحقیقی مقالہ جات بھی زیر مطالعہ رہے ہیں۔

10 - تحقیق کی اہمیت:

اس تحقیقی مقالے میں اردو ادب کے سفر ناموں میں موجود مصری تاریخ و تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس تحقیقی کام سے مصر کی تاریخ کے وہ گوشے جو اردو ادب میں پنہاں ہیں ان کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ادب بذات خود ایک تاریخ اور تہذیب اور حالات کے بیان کا نام ہے اور جب اس میں ماضی بعید اور دیگر علوم کی تاریخ بھی شامل ہو جائے تو ادب اس روشن نگینے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو الگ سے ایک پہچان بنالیتا ہے ۔

اس تحقیقی کام کے ذریعے اردو سفر نامہ نگاروں کا مصر کی تاریخ و تہذیب میں دلچسپی لینے کی وجوہات اور وہ تمام خصوصیات جو اردو کے سفر نامہ نگاروں کو اس خطے کی سیر پر مجبور کرتی ہیں۔اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اس کائنات میں موجود ہر وہ چیز جو تاریخ کا حصہ ہے وہ ادب کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ادب اور تخیل کا تعلق تو ازلی ہے اور جب اس تعلق میں تاریخ و تہذیب کو بھی شامل کر لیا جائے تو ادب کی شکل ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس تحقیقی کام کے ذریعے اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ اردو سفر ناموں میں خالص تاریخی واقعات اور مصری تہذیب کی شمولیت سے اردو ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اس تحقیقی کام سے ادب اور مصری تاریخ و تہذیب کے تعلق پر منفرد نوعیت کا تحقیقی کام سامنے آیا ہے۔ادب اور تاریخ کے حوالے سے یہ تحقیقی کام اردو تحقیق میں ایک مفید اضافہ ثابت ہوا ہے جو نئے تحقیق کرنے والوں کے لیے باعث رہنمائی بنا ہے۔

(ب) تاریخ اور تہذیب کے مباحث کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ا۔تاریخ کیا ہے؟

انسان نے زندہ رہنے کی کاوش میں خود اپنی ذات سے مقابلہ کیا اور اپنے اعضاء میں رفتہ رفتہ تبدیلیوں کو بھی اہمیت دی۔ چنانچہ اس کو زندہ رہنے کی خواہش نے وقت اور واقعات کے ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا

جہاں فطرت سے مبارزہ آرائی اس کا حصہ بن گیا۔ اسی جنگ و جدل نے خاکی تبدیلیاں رونما کیں۔ پہلی تبدیلی زبان کے بعد معاشرت قائم کرنا تھا۔ چنانچہ معاشرے کے قیام نے اس کو حیوان ناطق کے بعد مشترکہ جدوجہد سے روشناس کیا۔

اس جدوجہد کی کارستانیاں اور داستان کو انسان نے دوسروں کو بتانا شروع کیا جہاں سے فکری اور ذہنی ترقی کے ساتھ ابلاغ میں تغیر آیا۔ لہذا شکار کرنے کے واقعات روداد کو بڑی دلچسپی سے بیان کیا جانے لگا اور ایک خطے میں ساتھ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے مشترکہ زبان نے جنم لیا۔ یعنی ایک خطے میں بسنے والوں کی بولی میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا اور ان واقعات کو بیان کرنا بھی کوئی مشکل عمل نہیں تھا۔ بولنے والا اور سننے والے ایک ہی خطے سے تعلق رکھتے تھے اور مشترکہ زبان بولتے تھے معاشرہ بھی رفتہ رفتہ تغیر کرتا رہا جس کی وجہ سے زبان مزید نکھر گئی لہذا جن واقعات کو اجتماعی طور پر بیان کیا جانے لگا وہ عہد گزشتہ کی تاریخ بن گیا۔ الغرض یہ تاریخ اپنی مائیت میں واقعات کا مجموعہ ہے۔ جو واقعہ چند روز قبل بیان کیا گیا وہ امروز ماضی تو بن گیا لیکن اس نے تاریخ کی صورت اختیار کر لی۔ اس لیے کہ وہ واقعات گزر چکے ہیں اور تاریخ کا دارومدار گزشتہ واقعات پر انحصار کرتا ہے۔ لہذا انسان نے ابتدائی تحریر کا عمل درخت کے پتوں پر کیا، عمارت پر نقش ابھارا اور پھر رفتہ رفتہ پتوں سے چمڑے کا استعمال عام ہوا اور واقعات کو ان چمڑوں کے ٹکڑوں پر لکھا گیا۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ واقعات کا مجموعہ ہے جس میں قصائص بیان کیے جاتے ہیں یہ قصہ ہی آئندہ آنے والی نسل کی فکری، ذہنی اور نظری بلوغت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

تاریخ میں جب بادشاہوں کا دور شروع ہوا انھوں نے اپنے دور حکومت میں رونما ہونے والے واقعات کو قلمبند کرنے کے لیے خاص اتالیق مقرر کیے۔ جنھیں مورخ بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی تاریخ کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ یہ صرف بادشاہ کے گرد گھومتی تھی۔ اس کی شخصیت، طور اطوار، رہن سہن اور فتوحات کو مبالغہ آرائی سے بیان کیا جانے لگا۔ اس لیے یہ ایک طرف تاریخ ہوئی۔ جبکہ تاریخ میں فرد کے اعمال و افعال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فرد اپنی خواہشات کی بنا پر خود پر اور معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

چنانچہ فرد کی خواہشات کو موردِ الزام ٹھہرانے سے قبل اس کی نوعیت اور سماجی حیثیت کو ملحوظِ نظر رکھنا لازم ہے۔ اگر فرد کی بجائے اس عہد کے پیداواری رشتوں کا تعین کیا جائے تو یہ بحث اپنے منطقی انجام کو پہنچ سکتی ہے کہ فرد کے تمام اعمال و افعال اس دور کے اقتصادی محرکات کے گرد گردش کرتے ہیں، بادشاہوں کے عہد میں خطوں کو حاصل کرنا اور اپنی سلطنت کو طول دینا معاشی اسباب تھے کہ اس سے سلطنت کی گرفت

مضبوط اور مستحکم ہوئی تھی، چنانچہ یہ استقامت دائمی امر نہیں ہے اگر آج ایک بادشاہ کی حکومت مستحکم ہے تو آنے والے دنوں میں اس کی حکومت کو اندرونی اور بیرونی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ بیرونی خطرات کا سرچشمہ دوسری سلطنت کی طاقت ور فوج بنتی ہے اور جنگی ساز و سامان قرار پاتی ہے جبکہ اندرونی خطرات میں اس بادشاہ کا نظام عدل، طرزِ حکومت، مذہبی عقائد اور رسومات کو عمل دخل ہوتا ہے اس لیے تاریخ میں ہمیں مقامی یا اندرونی بغاوتیں بھی جا بہ جا ملتی ہیں۔

درباری تاریخ نویسی کی روایت انتہائی پرانی ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے بعد جہاں دیگر علوم میں تبدیلیاں نمودار ہوئی ہیں وہاں پر تاریخ کے فلسفے میں بھی تغیرات نے جنم لیا ہے۔ اب واقعات کو بغیر تصدیق کے تسلیم کرنا غیر سائنسی رویہ قرار پایا۔ اس ضمن میں ابن خلدون کا مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ تاریخ نویسی کا آغاز ہی ابنِ خلدون سے ہوا ہے یہ چودھویں صدی کا زمانہ ہے جب انھوں نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھی۔ نیز بعض مغربی محققین فلسفہ تاریخ کا آغاز ہیئر وڈولٹس، تھکی وائڈیس، پلاٹنی وغیرہ سے کرتے ہیں جو حقیقت کے منافی ہے۔ کیونکہ ہیر وڈولٹس نے بعض مقامات پر سنی سنائی باتوں پر انحصار کیا ہے اور تھکی وائڈیس کا زاویہ نگاہ بڑا محدود ہے اور رومی مورخین نے ان واقعات کو قلمبند کیا ہے جسے نہیں کرنا چاہیئے تھا اور جن کا ذکر کرنا چاہئے تھا ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

چنانچہ فلسفہ تاریخ اپنی مائیت میں ایک سائنس ہے جس کی بنیاد ابن خلدون نے رکھی تھی۔ انھوں نے مقدمہ میں تاریخ نویسی کے اصول بھی واضح کیے اور فلسفہ تاریخ کو حکمت کا درجہ دیا ہے۔ انہوں نے پیشرو مورخین کی تقلید یا اتباع کے بجائے اجتماع کے آغاز وارتقا کے قوانین دریافت کیے، کیونکہ ایک وقت تھا تاریخ کا عامیانہ تصور یہ تھا کہ یہ محض مجرد واقعات نگاری سے تشکیل پاتا ہے اور ایسی صورت میں مورخ کا کام صرف یہ تھا کہ وہ جو کچھ ہوا ہے اور گزرا ہے اس کو من وعن دہرائے یا تحریر کرے۔ نیز ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کی درست تعریف یہ ہے کہ دو گذشتہ قوموں کے حالات ان کے اخلاق وعقائد اور اندازِ سیاست کا بیان ہے اس حوالے سے مولانہ محمد حنیف ندوی اپنی کتاب ''افکار ابن خلدون'' میں لکھتے ہیں کہ :

> معمورہ ارض پر کن کن قوموں نے کس حالات میں فرمانروائی کے تخت بچھائے، انبیاء و حکما نے کیا ہدایات دیں اور ہماری عبرت پذیری کے لیے اپنی زندگیوں میں کیا کیا نمونے چھوڑے۔[1]

متذکرہ بالا تعریف کی اساس نظامِ سیاست، حالات و واقعات اور اخلاق پر مشتمل ہے اور اس میں عہد گذشتہ کو اولیت دی گئی۔ چنانچہ تاریخ کی اساس گزشتہ واقعات پر مشتمل ہے اور ان واقعات کو رقم کرنے والا مورخ کہلاتا ہے۔ بہر حال واقعات کی صحت کو پرکھنا اس کو مستند حوالہ جات سے جوڑنے کی ذمہ داری مورخین پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی بھی قوم یا خطے کی اجتماعی میراث ہے اس میں بد یانتی برتنا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

تاریخ کو اس کے اصل شواہد، حقائق اور واقعات کی صورت میں پرکھنے کی سعی کرنی چاہیے تاکہ اس کے تمام پہلو اجاگر اور واضح ہو سکیں۔ دراصل تاریخ قوموں کی شکست و زوال کی کہانی نہیں بلکہ اس کے اسباب، وجوہات اور محرکات کے اسباب کو دریافت کرنے کا عمل ہے اور اگر یہ عمل عنیت پرستی، تعصب یا ضعف شواہد پر استوار کیے جائیں گے تو اس کی وقعت اہمیت اور افادیت زائل ہوتی جائے گی۔ لہذا تاریخ کو عمومی لکیر نہیں سمجھا جا سکتا، اس کا ارتقا اور ترقی پیچیدہ عمل ہے اور عام مغالطہ یہ بھی ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ واقعات میں مماثلت ہونا الگ بحث ہے لیکن خود کو دہرانا فلسفیانہ بحث ہے کیونکہ جو عمل ایک بار پیش آچکا ہے اس کے اسباب اور مادی حقائق دوسرے عہد میں اس سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اسباب اور مادی حقائق زمان و مکان میں بھی مماثلت ہو جبکہ زمان و مکان جامد نہیں ہیں بلکہ مسلسل ارتقاء پذیر ہوتے ہیں لہذا اس لیے یہ کہنا کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے مکمل لغو اور فضول بات ہے مارکس نے کہیں لکھا تھا کہ تاریخ خود کو نہیں دہراتی اگر دہراتی ہے تو دہرانے کا عمل المیاتی صورت میں ہو سکتا ہے چنانچہ یہ ان کا طنز تھا۔

تاریخ دراصل قوموں کی روداد ہے جس میں ان کے رہن سہن، نظریات، عقائد و اخلاق، طرزِ حیات اور نظامِ سیاست کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ واقعات کے تسلسل کو تاریخی شواہد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور یہ تاریخ ہی ہے جو ماضی کی شاندار روایت رکھنے والی قوموں کی شکست وریخت سے آگاہی دیتی ہے اور اسی کے ساتھ ان اسباب کو کبھی پہاڑ کی بلندی سے پستی کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے اور کبھی پستی سے بلندی کی جانب سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لہذا تاریخ وہ گوشہ ہے جہاں اقوام کی عہدِ گزشتہ کی کامیابیاں اور ناکامیاں ایک ساتھ بین کرتی ہے اور کامیابی پر فخر اور ناکامی پر آنسو بہاتی ہیں یہ ایک حیرت کندہ اور عبرت کندہ ہے۔ جہاں حیرانگی اور عبرت کا ملا جلا احساس ایک ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ اس لیے مورخ کا قلم لہو اور آنسو کا مرکب ہوتا ہے۔ چنانچہ مورخ واقعات کو صرف بیان ہی نہ کرے بلکہ ان میں جو ربط و تعطیل کا ایک قدرتی سلسلہ ہے اس کو بھی دریافت کرے اور ان مقامات و احوال کی نشاندہی بھی کرے جو قوموں کے عروج و ادبار کا باعث اور سبب ہو

سکتے ہیں، تاکہ اس سے دوسری اقوم سبق بھی حاصل کریں اور اپنے مستقبل میں اٹھائے ہوئے اقدامات سے باخبر بھی رہیں کہ تاریخ کیا سیکھاتی ہے۔ کیونکہ تاریخ مسلسل سیکھنے کا عمل بھی ہے اور ترقی کا ضامن بھی ہے۔

۲۔ فلسفہ تاریخ:

تاریخ کو ایک زمانے تک صرف ماضی کی داستان کا درجہ حاصل تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ دیگر علوم کی طرح اس میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وقت کے ساتھ اس کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوا چنانچہ اس کی اہمیت میں اضافہ ابن خلدون کے مقدمے سے شروع ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے تاریخ کو اس عہد کے سائنسی اصولوں پر استوار کرنے کی سعی کی۔ نیز ان کا مقدمہ اس حوالے سے فلسفہ تاریخ کے لیے بوطبقا کا درجہ رکھتی ہے۔ ابنِ خلدون شمالی افریقہ کے ملک تیونس میں پیدا ہوئے۔ عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے ہجرت کر کے اسپین گئے پھر مراکش آئے اور پھر تیونس میں آباد ہو گئے۔ انھوں نے بادشاہوں کو بہت قریب سے دیکھا، ان کی جاہ و جلال، حشمت اور طرزِ حکمرانی کا مشاہدہ بھی کیا۔ سیاحت بھی کی اور اہم عہدوں پر بھی فائز رہے۔ ان کی ملاقات منگول فاتح تیمور لنگ اور یورپ کے ظالم پیڑ سے بھی ہوئی اہم عہدوں پر رہنے کے باوجود صاحب اقتدار کی ناراضگی کی وجہ سے جیل بھی گئے اور کچھ عرصہ مصر میں بھی رہے۔ چنانچہ ان کی وجہ شہرت مقدمہ ابنِ خلدون سے ہوئی جس کے تراجم دنیا بھر کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مشرق و مغرب ان کے مقدمے سے استفادہ کر چکا ہے اور فلسفہ تاریخ کے اہم موضوعات سے بھی روشناس ہو چکا ہے۔

ابنِ خلدون نے اپنے "مقدمے" کی ابتدا میں تاریخ کی اہمیت وافادیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس ضمن میں انھوں نے مورخین کی خرافات، مبالغہ آمیز تصوراتی خیالات کا ذکر بھی کیا ہے کہ مورخین اپنے پیشرو کی نقل اور تقلید پر بھروسہ کرتے ہیں اور روایت کو کسی اصول یا حقائق کے تحت جانچے بغیر بیان کر دیتے ہیں۔ جو اکثر حقائق کے منافی ہوتا ہے اور تصوراتی واقعات پر زورِ قلم کی جلاد کھائی جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے روایت کی درستی پر زور دیا، سنی سنائی روایت سے اجتناب کیا اور تاریخ کو فلسفے اور حکمت کا درجہ دیا ہے اور اصولِ تاریخ نگاری پر اجتہادی نقطہ نظر پیش کیا۔

ان کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مورخین کو توہم پرستی سے آزاد کرنے کی سعی کی اور سماجی و قومی مسائل کو عقل کی روشنی میں سمجھنے اور حل کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب بھی صراحت سے بیان کیے ہیں ان کے مطابق قومیں اپنی قسمت خود بنائی ہیں اور اپنے زوال، پستی،

شکست اور تباہی کی ذمہ دار بھی خود ہوتی ہیں، انھوں نے خارجی اسباب کو مکمل رد نہیں کیا ہے لیکن داخلی وجوہات کو اولیت دی ہے، ابن خلدون کے مطابق:

> جن قوموں میں عصبیت کم ہوتی ہے یا اس کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے۔ وہ زوال کی جانب سفر کرتی ہیں۔ لہذا ہمارے یہاں عصبیت منفی معنی میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے جو ابن خلدون نے استعمال کیا ہے پہلے اس کے معنی کی وضاحت لازمی ہے۔ ان کی تحریروں میں عصبیت سے مراد ہے کہ جو کسی قوم گروہ یا قوم میں محبت، اخوت اور یک جہتی کے شدید احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ (۲)

چنانچہ انھوں نے عصبیت کو بہت اہمیت دی ہے۔ انھوں نے جہاں مورخین کو توہم پرستی، روایت پرستی سے دور رہ کر حقائق کی روشنی میں تاریخ نویسی کے اصول وضع کیے ہیں وہیں پر انھوں نے معاشیات یا عمرانیات کو اہم جز قرار دیا ہے۔ معاشی ابتری ان کے یہاں زوال کا اصل سبب ہے اور مورخین کو تاریخ لکھتے وقت اس عہد کے معاشی رشتوں اور پیداواری ذرائع پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ نیز ان کی معاشیات پر وہ نظر نہیں ہے جو مارکس نے رکھی ہوئی تھی لیکن ان کے یہاں معاشی وسائل پر بحث ضرور ملتی ہے۔ لہذا انہوں نے تاریخ نگاری کو سائنس بنانے کی کوشش کی ہے اقتصادی واجتماعی مطالعے کے بعد ایک فلسفہ کی طرح منطقی نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مورخ کے لیے بھی اصول بنائے ہیں۔

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ:

> مورخ کے لیے لازمی ہے کہ وہ ملکی سیاسی قواعد اور موجودات کے طبائع سے واقفیت رکھتا ہو، قومیں اور زمین وزمان، عادات واخلاق، سیرت وخصلت، مذہب وملت اور دیگر حالات میں جن اخلاقی دوروں سے گزرتی رہتی ہیں ان سے بھی آشنا ہو، نیز قابلیت رکھتا ہو کہ حاضر و موجود کو غائب سے ملا کر دیکھے کہ ان میں اتفاق ہے یا اختلاف۔ اتفاق کی بھی علت تلاش کرے اور اختلاف کی وجہ بھی دریافت کرے۔ (۳)

ان کے اصول کے مطابق مؤرخ کو دیگر علوم کی بھی معلومات ہو اور روایت کی صحت کو کئی طرح کے علوم سے تحقیق کرے کہ جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان کے اسباب کیا ہیں اور ان کے محرکات تک رسائی کرے اور اس کی اپنی ذہنی قابلیت اس قدر بلند ہو کہ وہ ان کے تسلسل اور تعطیل کی علت تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ وہ تاریخ کو جامد تصور نہیں کرتے بلکہ مسلسل تغیر و تبدل پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک ہر

عہد میں اقوام کی زندگی ان کے اخلاق و عادات و اطوار بدلتے رہتے ہیں۔ معاشرت یا اس میں بسنے والے لوگ ایک ہی حالت میں نہیں رہتے بلکہ قوم مختلف لوگوں کا مجموعہ یا گروہ ہے اس لیے اس میں بعض بہادر، دلیر اور شجاعت رکھتے ہیں اور بعض مہم جو بھی ہوتے ہیں ایک ہی قوم کے فرد ہونے کے باوجود ان کی خصوصیات میں تفریق ہوتی ہے۔ بعض ہنر مند اور جنگ کے ماہر ہوتے ہیں اور بعض صلح جو ہوتے ہیں یہ تمام خصلتیں بیک وقت پروان چڑھتی ہیں۔ لہذا انھوں نے انسانی اجتماع کا بغور اور طاہرانہ مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے قوموں کے زوال کے چند اسباب تحریر کیے ہیں۔

> پہلا دور جس میں فاتح قوم کے اقتدار میں پوری پوری قوم شریک رہتی ہے اس لیے حکومت کا دفاع بھی مل کر کرتے ہیں، اس دور میں بادشاہ قوم کے دوسرے افراد سے زیادہ منفرد نہیں ہوتا۔ دوسرے دور میں انفرادی و شخصی حکومت پیدا ہوتی ہے اور اس دور میں بادشاہ اپنے خاص اور پسندیدہ افراد کو اعلیٰ عہدے دیتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے اقتدار کی حفاظت کرتا ہے۔ تیسرا دور اقتدار کے استحکام کا ہوتا ہے اور چوتھا دور قناعت پسندی اور صلح جوئی کا ہوتا ہے۔ نیز پانچواں دور اسراف و فضول خرچی کا ہوتا ہے۔[۴]

اگر ابن خلدون کے ان نکات کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا اطلاق آج بھی تمام حکومتوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ جمہوری کیوں نہ ہوں، پہلے دور میں حاکم عوام کے ساتھ مضبوط رابطہ استوار کرتا ہے اور ان جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام ہر محاذ پر اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کا دفاع کرتی ہے۔ جبکہ دوسرے دور میں بادشاہ اپنے من پسند لوگوں کو نوازتا ہے اور وہ لوگ پھر اپنے من پسند لوگوں پر عنایت و اکرام کے تمام دروازے کھول دیتے ہیں۔ جہاں سے بادشاہ اور عوام میں خلیج مائل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اقتدار کو استحکامت ملتی رہتی ہے۔ عوام ابھی ناامید نہیں ہوتے لہذا قناعت اور صلح جوئی اختیار کرتے ہیں نیز آخر میں اوپر کی سطح سے عیش و عشرت کا بازار گرم ہوتا ہے اور بادشاہ کے وزراء بھی فضول خرچی کرتے ہیں جس کے اثرات فوج پر بھی پڑتے ہیں اور فوج دن بہ دن جنگی اور اخلاقی اعتبار سے کمزور ہوتی جاتی ہے اور یہی عصبیت کی کمزوری ہوتی ہے جس سے دوسری سلطنت کو موقع ملتا ہے اور وہ عصبیت کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر حملہ کر دیتی ہے۔

حکمران عیاشی میں مصروف عمائدین سلطنت فضول خرچی میں لگی رہتی ہے، فوج کمزور ہو چکی ہوتی ہے ایسے میں عوام بھی حکومت کا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ ابن خلدون شہری زندگی پر دیہی یا

بدویت کو سبقت دیتے ہیں۔ یہاں تک ٹیکسس کو بھی کمزور گردانتے ہیں اور کھیتی باڑی کو بھی عصبیت کی کمزوری سمجھتے ہیں، ان کے مطابق جو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں وہ زمین سے جڑ جاتے ہیں اور اس کو چھوڑنے کو راضی نہیں ہوتے لہذا ان کے یہاں بدویت امر رہنے کی علامت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابن خلدون نے تاریخ کو تغیر و تبدل قرار دیا ہے اور صداقت کو اولیت دی ہے اور شکست وریخت کے اسباب اور علت کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

ژیام بانستا ویچو ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوئے، ان کی شہرہ آفاق کتاب کا نام "جدید سائنس" ہے۔ جس میں انھوں نے فلسفہ تاریخ پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ یہ مغرب کے پہلے فلسفی ہیں جنھوں نے فلسفہ تاریخ کو ایک ضابطے اور ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ ویچو ستر ہویں صدی کے تاریخ دان ہیں جنھوں نے تاریخ کو انسانی ذہن کے ارتقاء، ترقی اور تبدل کو سمجھنے کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے مختلف زمانوں اور ادوار کا پتہ چلتا ہے اور ان ادوار میں انسان کے اعمال وافعال، کردار اور دیگر خصوصیات بھی شامل ہیں لہذا مختلف ادوار کے مطالعے سے انسانی ذہن کی جودتِ طبع، اندازِ فکر، طرزِ حکمرانی اور نظریات و خیالات کا علم ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے زبان، سیاست اور قانون کی مدد سے تاریخ کو سمجھنے کی سعی کی ہے اور انھوں نے تاریخ کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔

پہلا دور دیوتاؤں کا ہے، دوسرا دور سورماؤں کا ہے اور تیسرا دور عوامی ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان دیوتاؤں کی پوجا کرتا ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مختلف فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ جبکہ پجاری جو دیوتاؤں کا نائب ہوتا ہے اور ان کے مزاج سے بخوبی واقف ہوتا ہے وہ معاشرے پر براہ راست اپنے قوانین بھی نافذ کرتا ہے۔ دوسرے دور میں بہادر، طاقتور اور عظیم جاہ وجلال رکھنے والے افراد لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ تیسرا دور انتہائی اہم ہے جو اپنی مائیت میں حقیقی اور عوامی لگتا ہے۔ اس دور میں قوانین بنائے جاتے ہیں، شہر آباد کیے جاتے ہیں عوام اپنی حکمرانی قائم کرتے ہیں۔

اگرچہ ان ادوار کو ذہنی یا ارتقاء کے نقطہ نظر سے پرکھا جائے تو پہلا دور مذہبی یا اساطیری معلوم ہوتا ہے دوسرا دور افسانوی اور تیسرا دور صداقت پر مبنی دکھائی دیتا ہے۔ ویچو کے خیالات کے مطابق جمہوری طرز حکمرانی میں ہر شخص کو اختیارات ملتے ہیں اور وہ ان کا درست استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ بلکہ جمہوریت انتشار کو جنم دیتی ہے نیز ان کے تصورات بادشاہت کی حمایت کرتے ہیں وہی تمام نظام سیاست اور ریاست کے معاملات کو بخوبی چلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بادشاہت کا خاتمہ معاشرے میں انفراری کو جنم دیتی ہے۔ جس

سے جمہوریت پروان چڑھتی ہے اور جمہوریت آمریت کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے جس سے سارا معاشرہ انفراری کا شکار ہو جاتا ہے۔ ادارے تباہ ہو جاتے ہیں چنانچہ ان کو نظریات پر بادشاہت کا غلبہ کافی غالب نظر آتا ہیں۔

نیز تاریخ کو فلسفہ کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے خیال کے مطابق مؤرخ اور فلسفی کے کام میں مماثلت ہے، فلسفی واقعات اور ارتقاء کو درست طریقہ سے تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور انسانی ذہن و سماج کے تمام مظاہر کو سمجھنے کی قوت رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی تاریخ امید و ناامیدی، کامرانیوں اور ناکامیوں کی تاریخ ہے۔ کامیابی کا زمانہ "مشاہیر کا زمانہ" ہے جب قوم کے مختلف اثر و رسوخ رکھنے والے قبائل کے سردار اتحاد کرتے ہیں اور گروہ بندیاں کرتے ہیں تاکہ داخلی و خارجی خطرات کا مقابلہ کیا جا سکے اس درجے کی خصوصیت یہ ہے کہ قوم اعلیٰ وادنی طبقات میں منقسم ہو جاتی ہے اور نادار لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ ان کا استحصال کرتے ہیں اور اس کشمکش کی وجہ سے تفریق جنم لیتی ہے اور بالآخر نادار لوگوں کو فتح نصیب ہوتی ہے اور اس طرح عام لوگوں کا زمانہ آجاتا ہے اور اسی عہد میں بددیانتی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے افراتفری اور انتشار کو ہوا ملتی ہے جہاں سے زوال کا آغاز شروع ہو جاتا ہے اور قوم آخر کار پستی کی جانب سفر شروع کرتی ہے اور بربریت و حیوانیت در آتی ہے جس کی وجہ سے اکثر و بیشتر اخلاق کی کمزوری اور مذہب سے بیزاری ہوتی ہے۔ ویچو کی رائے میں ہر قوم ترقی و پستی عروج و زوال کے اس دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے ہر پس ماندہ قوم بلندی اور ترقی کی جانب سفر کرے گی اور ترقی یافتہ قوم کو زوال آئے گا۔

ایمانوئل کانٹ ۱۷۲۴ء میں کونگبرگ میں پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد کونگبرگ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ چنانچہ ۱۷۷۰ء میں انھوں نے تاریخ کے حوالے سے ایک مضمون تحریر کیا جس میں تاریخ کو کرہ اصولوں پر لکھنا چاہیے بحث کی ہے۔ کانٹ اسی مضمون کی وجہ سے علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے حوالے سے کافی مقبول ہوئے۔ نیز انھوں نے فطرت اور عقل کو اولیت دی ہے۔ ان کے نزدیک فطرت کا مقصد مخلوق کی تشکیل ہے اور انسان اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے تاریخ اور فطرت کے تعلق کو مستحکم رکھا ہے اور تاریخی شعور کو نئی جہت دی ہے۔ ان کے مطابق تاریخ کے ذریعے فطرت کے منصوبے کو سمجھا جا سکتا ہے اور یہ تاریخی شعور سے ممکن ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی مختصر ہوتی ہے اس لیے تاریخی تسلسل اور تاریخی شعور کی مدد سے فطرت کے قوانین اور منصوبوں کا ادراک و فہم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ انسان کا جوہر اس کی سوجھ بوجھ، فہم و عقل ہے اور فطرت نے انسان کو اس لیے جنم دیا ہے کہ عقل کا پابند رہے۔

عقل کی پابندی انسان کے لیے لازم عنصر ہے اور انسان کو آزادی میں بھی چند پابندیوں میں رہنا چاہیے اور یہ پابندیاں فطرت نے عائد کی ہیں۔ چنانچہ یہ پابندیاں اسے کامل انسان بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ معاشرے کا قیام پابندی کے اصولوں کو واضح کرتا ہے کہ انسان قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فطرت، تاریخ اور تاریخی عمل میں فطری قوتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آفاقی تاریخ کے نو اصول ترتیب دیے ہیں۔ ایمانوئل کانٹ کے مطابق:

۱۔ فطرت نے اپنی مخلوق میں جو صلاحتیں پیدا کیں ہیں انہیں منکشف ہونا چاہیے۔

۲۔ انسان میں جو فہم وادراک کا مالک اس میں فطری صلاحیتں انفرادی طور پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر پیدا کیں ہیں۔

۳۔ فطرت نے انسان میں حیوانی خواہشات پیدا کیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اسے فہم وادراک کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ تاکہ انسان اس کے ذریعے خوشی و مسرت کی تکمیل کرے اور انسان انفرادی طور پر فانی ہے اور مجموعی طور پر غیر فانی ہے۔

۴۔ فطرت انسان کو غیر تحرک اور ساکت نہیں رہنے دیتی اور وہ آپس کے اختلافات سے انسان کی صلاحتوں کو ابھارتی اور اس کی پرورش کرتی ہے۔ یہاں اختلاف سے مراد غیر سماجی سرگرمیاں اور فطری رائیں ہیں۔

۵۔ انسانی نسل کا سب سے بڑا مسئلہ جس کے حل کے لیے فطرت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جو آفاقی قدروں اور قوانین پر ہو، جس میں صحیح آزادی کا استعمال ہو اور انسان مکمل آزادی کے بجائے پابند اور محدود آزادی کو پسند کرے۔

۶۔ انسان جب اجتماعی زندگی گزارتا ہے تو اسے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی سرگرمیوں اور حرکات پر نظر رکھے اور اس کو موقع نہ دے کہ وہ دوسروں کی آزادی ختم کر کے اپنی آزادی کو ناجائز طور پر استعمال کرے اس مقصد کے لیے قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔

۷۔ دنیا میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ریاستوں کے آپس میں قانونی تعلقات ہوں چھوٹی ریاستوں کی حفاظت بین الاقوامی فیڈریشن پر مبنی ہے۔ تمام جنگیں فطرت کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہیں تاکہ قوموں میں نئے تعلقات پیدا ہوں۔ اس تباہی و بربادی سے نئے سیاسی نظام کی تشکیل ہوئی ہے۔ کوئی بھی سیاسی نظام دائمی نہیں ہے۔ تاوقت کہ کوئی مکمل نظام نہ آجائے۔

۸۔ نسل انسانی کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فطرت کے چھپے ہوئے منصوبوں کی تکمیل کر رہی ہے انسان سیاسی دستور اور ریاست کو اس مشکل میں تخلیق کرتا ہے تاکہ فطرت نے اسے جو صلاحیتں دی ہیں وہ پوری طرح بروئے کار آسکیں۔ فطرت سیاسی انقلابات اور تبدیلیوں کے ذریعے اپنے منصوبوں کی تکمیل کر رہی ہے۔

۹۔ تاریخ فطرت کے منصوبے کی تکمیل کی جانب جارہی ہے۔ قوموں اور ریاستوں کی ے انون اور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں جو خوبیاں تھیں ایک خاص وقت کے بعد ان میں برائیاں بڑھ جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ نظام کے خاتمے پر ہوتا ہے لیکن اس تباہی میں ترقی کی چنگاریاں ہوتی ہیں اس لیے ہر انقلاب تبدیلی، تباہی اور ترقی کی علامت ہوتا ہے۔(۵)

کانٹ کے یہ اصول آفاقی تاریخ کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس اصول کے تحت تاریخ مطالعہ اور فلسفہ تاریخ کے خدوخال سمجھنے میں معاونت ملتی ہے چنانچہ انھوں نے کلیدی طور پر اخلاق پر زور دیا ہے کہ اخلاق کی پستی اقوام کو تباہی سے ہم کنار کرتی ہے جبکہ ان کا زمانہ فکری اور معاشی انتشار کا زمانہ تھا، یورپ میں بیداری کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی کلسائیت اور شخصی آمریت روبہ زوال ہو رہی تھی۔ ان کے نظریات پر اس عہد کے اثرات بھی ملتے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی جگہ یہاں پادریوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ موصوف کے اس جملے پر شاہ پر شیانا راض ہوگئے اور ان کو خط بھی لکھ کر تاکید کی۔ کانٹ کے نظریات خرد افروزی کی حمایت میں تھے اور ان کا شمار ان فلسفیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے یورپ میں شاہ ثانیہ کے لیے تگ ودو کی۔ اس لیے انھوں نے تاریخ کو عالم انسانی کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی۔ ان کے مطابق تاریخی واقعات ایک تسلسل رکھتے ہیں۔ خواہ خطے کے اعتبار سے انفرادیت رکھتے ہوں لیکن انسانی تاریخ وارتقاء کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ان میں وحدت اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ نیز

کانٹ یورپ کے پہلے فلسفی ہیں جس نے فلسفہ تاریخ کو فلفسیانہ حالات و واقعات ان پر گزرے ہیں۔ ان کا درست فہم وادراک حاصل کیا جائے۔انسانی تاریخ قدیم غاروں سے مہذب معاشرے تک جو پہنچی ہے اس کے پس پردہ کونساڈرامہ کھیلا جارہاہے۔اس ڈرامے کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہیگل انسانی جدوجہد، کوشش، ترقی اور انسانی عروج بلندی کے پس منظر میں عمل پذیر جذبہ آزادی کے نام موسوم کرتا ہے۔اس کے نزدیک انسانی تاریخ اور انسانی ڈرامہ کا پلاٹ:

> آزادی کی ترقی ہے۔ آزادی سے مراد وہ حقوق اور قانون ہے جس کے نتیجہ میں ریاست وجود میں آتی ہے۔ آزادی روح کا جوہر ہے اور تاریخ فلسفہ کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے تاریخ کا موضوع سائنس سے جدا ہے۔[۶]

انسان کی یہی جذبہ آزادی ریاست کی بنیاد رکھتی ہے ذہن کا ارتقاء اور ترقی دراصل آزادی کی ترقی ہے اور آزادی کی ترقی سے روح ترقی کرتی ہے۔ یہاں آکر ہیگل مادہ اور روح کے مباحث کو شروع کر دیتے ہیں اور روح کو آزادی کا کشش ثقیل قرار دیتے ہیں۔ لہذا ہیگل اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے اور اس کا ہر دور دوسرے سے منسلک ہے۔ماضی حال میں پیوست ہے اور ہر قوم ترقی اور عروج کے بعد روبہ زوال ہوتی ہے تو اپنا تاریخی ورثہ چھوڑ جاتی ہے اور اس ورثے سے دیگر اقوام استفادہ کرتے ہیں اگر وہ لینا چاہیں۔

ہیگل نے واقعات کی اکائی اور وحدت میں ارتقائی تسلسل کو دریافت کرنے کی سعی کی ہے اس کے علاوہ انھوں نے تاریخ میں شخصیات کے کردار کو بھی اہمیت دی ہے کہ بعض کردار اپنے اعمال وافعال کے ذریعے تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں بلکہ وہ تاریخی واقعات پر اپنی چھاپ بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ان کا اس نقطے نے فرد کے کردار پر نئے سولات کو جنم دیا۔ جس پر روسی دانشور خارجی پلیخانوف کی پوری ایک کتاب "تاریخ میں فرد کا کردار" لکھی ہوئی ہے۔ نیز انھوں نے کانٹ سے اس نقطے پر بھی اختلاف رکھا کہ فطرت کا تاریخ سے کوئی تعلق ہے اور فطرت کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی جبکہ تاریخ صرف نسل انسانی کی ہے اور وہ بھی تب بنتی ہے جب اس میں کوئی عمل کیا جائے اور اس کے علاوہ انھوں نے تاریخ خود کو دہراتی ہے کے مفروضے کو مکمل رد کیا ہے کیونکہ تاریخ کا گردش گول نہیں بلکہ مخروطی شکل میں ہے ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی گردش یا حرکت خود کو دہرا سکے لہذا یہ حرکت در حرکت ہے اس کے علاوہ ان کے نزدیک تاریخ انسان کے افعال، اعمال، طریق سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ ان نظریات نے ایک عرصے تک تمام یورپ کو اپنی گرفت میں رکھا اور فلسفہ میں انہیں تاحال بلند مقام حاصل ہے۔

ہیگل کے حلقہ بگوش کارل مارکس ایک عرصے تک ہیگل کے فلسفے کا پرچار کرتے ہیں اور پھر ان سے نظری و فکری اختلاف بھی رکھا۔ انسانی تاریخ کا یہ نابغہ روزگار شخص، ساری زندگی جدوجہد، مفلسی اور مزاحمت کی علامت بنا رہا۔ دربدری، جلاوطنی، تہمیت اور دشنام کی زد میں زندہ رہنے والا فرد ساری دنیا کے محنت کشوں کا مسیحا مانا جاتا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق داس کیپٹل، کمیونسٹ مینسفیسٹو دنیا بھر کی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔

ان کے فلفسیانہ نظریات کا جوہر "جدلیات" میں پیوست ہے۔ انھوں نے تاریخ کو خالصتاً معاشی اور اقتصادی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے پیش رو مورخین اور فلسفیوں سے اختلاف رکھا کہ تاریخ فطرت کے تابع نہیں ہے اور نہ ہی اس میں اختلاف کا عمل دخل ہے اور نہ ہی کسی مافوق الفطرت کی کارستانی ہے۔ بلکہ انسان کی جتنی بھی تاریخ گزری ہے اس میں معاشیات کا کلیدی عمل ہے۔ انھوں نے انسانی تاریخ کو اقتصادی نقطہ نظر سے تقسیم کیا پہلا دور قدیم پنچائتی دور کہلاتا ہے جہاں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں ملتا اور ہر انسان یکساں محنت کرتے ہیں اس کے بعد غلامانہ دور کا آغاز ہوتا ہے جہاں غلام اور آقا کا وجود پایا جاتا ہے۔ آقا ان سے بیدردی سے کام لیتا ہے اور اس دور میں غلاموں کی آقا سے بغاتوں کی داستان رقم ہوتی ہے۔ بعد از جاگیرداری کا دور شروع ہوتا ہے یہاں معاشی رشتے تبدیل ہو جاتے ہیں اور کسان اور جاگیردار کا رشتہ جنم لیتا ہے۔ یہ دور بھی صدیوں پر محیط ہے۔ لہذا جاگیرداری میں کلسائیت کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جس کے خلاف سرمایہ دارانہ بغاوت کا آغاز ہوتا ہے۔ سرمایہ دار نئے رشتوں کو استوار کرتا ہے۔ یہاں سرمایہ کا ارتکاز چند ہاتھوں میں جمع ہونا شروع ہوتا ہے اور اس نظام کو سوشل ازم کے ذریعے ختم کیا گیا ہے۔

مارکس ساری انسانی تاریخ کو ذرائع پیداوار اور آلات کی تبدیلی کی تاریخ قرار دیتا ہے اور صرف غلامی کی شکل وصورت کی تبدیلی گردانتا ہے۔ مارکس نے تاریخ کو مادی قصور اور اصولوں پر استوار کیا۔ جس کو وہ "تاریخی مادیت" سے موسوم کرتا ہے۔ چنانچہ ساری انسانی تاریخ کو طبقاتی کشمکش کی تاریخ قرار دیتے ہیں اس کشمکش کا خاتمہ ایک لاطبقاتی سماج کے قیام سے ممکن ہے اور ان کی فلسفہ تاریخ کا حرکی قوت معاشیات و اقتصادیات پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ دیگر ماہرین نے بھی فلسفہ، تاریخ پر اپنے اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا ہے جس میں اشپنگر ٹائن بی ہرڈر جورک ہارڈٹ، کولنگ وڈ، کروچے، رینائر، ول ڈیورانٹ اور برٹنڈرسل بھی قابل ذکر ہیں۔

تاریخ کو ایک زمانے تک مذہبی تصور میں پیش کیا گیا کہ خدا تعالیٰ زمین پر مختلف ادوار میں اپنے نمائندے بھیج کر زمین پر بسنے والوں کی اصلاح اور ہدایت کرتا ہے نیز اسدور میں تاریخ کا مادی تصور آیا جس نے تمام حقائق شوائد اور روایت کو مادی ترقی، موجودات اور مظاہر میں دیکھنے پرکھنے کی سعی کی۔ ان کے مطابق تاریخ

انسانی کی محنت، اعمال اور افعال کا نتیجہ ہے۔ اسی دوران بعض فلسفی ایسے گزرے ہیں جس نے تاریخ کو ایک گردش قرار دیا ہے۔ بعض اس کی گردش مخروطی قرار دیتے ہیں اور بعض گول گردش کا تصور پیش کرتے ہیں۔ لہذا تاریخ کا ترقی پسند نظریہ سائنسی اصولوں میں پیوست ہے۔ تاریخ تسلسل اور سلسلہ وار زنجیر ہے اور فلسفہ تاریخ اس کو سمجھنے پرکھنے اور احاطہ کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

۳۔ تاریخ کی اہمیت وضرورت:

انسان کو ہمیشہ اپنے ماضی سے دلچسپی رہی ہے، تلاش، کھوج اور جستجو اس کا ثانیہ ہے۔ وہ عہد گذشتہ میں بڑی رغبت رکھتا ہے وہ اس تلاش میں رہتا ہے کہ وہ جان سکے اور سمجھ سکے کہ اس کے پیش رو زندگی کیسے بسر کرتے تھے۔ یہی شوق تاریخ کے مطالعے کی جانب راغب کرتا ہے اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ سنے سنائے قصوں پر قناعت نہیں کرتا بلکہ خود بھی دلچسپی لے کر تحقیق و جستجو میں جت جاتا ہے۔ چونکہ تحقیق کے معنی ہیں بار بار کھوج کرنا یا حق کی تلاش کرنا ہے لہذا وہ تجربات ومشاہدات کے ڈگر پر نکل پڑتا ہے۔

چونکہ تاریخ کی اصل اساس ماضی ہے اس لیے ہم اس کو عہد گذشتہ کی دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ اس دستاویزات کے مطالعے سے ہی ہم کسی بھی قوم کی حقیقی نفسیات کا احاطہ کر سکیں گے۔ اس کے رہن سہن، سوچنے کا انداز، فیصلہ سازی، نظامِ سیاست اور طرزِ حیات کا علم تاریخ سے ملتا ہے یہ تاریخ کی خوبی ہے کہ وہ ہمیں صدیوں پرانے دور کے تمام عوامل کا عکس اور حقیقت دیکھنے کو دیکھتی ہے اور کسی بھی خطے کی آب وہوا، موسم، مناظر اور اہم مقامات کو یوں پیش کرتی ہے۔

گویا قاری کی آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو اور اس کے علاوہ تاریخ کا مطالعہ دراصل نظریات، خیالات، اخلاقیات کا مطالعہ ہے۔ کیونکہ تاریخ میں نظریات، خیالات اور اخلاقیات کبھی ایک جیسے نہیں ملتے۔ یہ زماں و مکاں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور جو تہذیبیں پروان چڑھی جنھوں نے ساری دنیا پر حکومت کی اور پھر صفحہ ہستی سے مٹ گئیں ہیں ان کا مطالعہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ ہم اس سے سبق حاصل کریں کہ دھرتی پر کیسی عظیم الشان قومیں آباد تھیں جنھوں نے بحر و بر پہ اپنی حکمرانی کا سکہ جمایا لیکن وقت جو تغیر آمادہ ہے۔ نو بہ نو کروٹ بدلتا رہتا ہے اس نے عظیم قوموں کی عظیم ترین عمارتوں کو ریت کے ڈھیر میں بدل دیا ہے۔ چنانچہ تاریخ کی یہی خوبی ہے کہ بیک وقت امید و ناکامی کی کہانی سناتی ہے۔ اس کہانی میں نظریات بھی ملتے ہیں جو انسانی ذہن کی بلوغت اور پختگی کو عیاں کرتے ہیں۔ طرزِ حکمرانی بھی ملتی ہے اور بہادر کردار بھی ملتے ہیں۔ دراصل تاریخ کا مطالعہ اپنی ذات کا مطالعہ کرنے کے مترادف ہے۔

تاریخ کا اگر مذہبی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں خیر و بشر کی مبارزہ آرائی ملتی ہے کہ خیر تمام تکالیف برداشت کرتا ہے۔ پے در پے امتحانات اور مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور ہر طرف سے اس کے لیے رسوائی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی خیر والی قوت سے شیر کا بالآخر شکست سے دوچار کرتا ہے اس ضمن میں تاریخ نیکی اور بھدی کا سابقہ بھی ہے اور امید بھی ہے کہ مشکلات کے اختتام پر ابدی اور دائمی خوشی ہے۔ چنانچہ تاریخ کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ آئندہ نسل اپنی گذشتہ نسل کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور ان کی ایجادات سے استفادہ کرے اور ان کی غلطیوں سے سیکھے تاکہ وہ ان غلطیوں کو نہ دہرائے جو اس کے پیشرو نے غلطیاں کیں ہیں۔ تاریخ ہمیں خود تنقیدی کے عمل سے گزارتی ہے کیونکہ زندہ قوموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اقدامات پر خود تنقید سے گزرتے ہیں۔

کسی قوم کی ذہنی بلوغت کی نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے ماضی کو تنقید کا موضوع بناتے ہیں تاکہ ان کا حال اس سے اچھا ہو۔ انہی خامیوں کی نشاندہی کرنا بالغ نظری کی عمدہ مثال ہے۔ چنانچہ زندہ قومیں خود تنقیدی اور تجربے سے اہم نتائج اخذ کرتی ہیں اور ماضی و حال کی خامیوں اور غلطیوں کو سمجھ کر فہم و ادراک کے ساتھ مستقبل کے لیے درست راستہ تلاش کرتی ہیں۔ وہ کوشش کرتی ہیں تاریخی عوامل نے انہیں شکست و ریخت کی منزل پر کھڑا کر دیا ہے تو وہ مزید تباہی کا راستہ اختیار نہ کریں بلکہ نئی رائیں اور سمت تلاش کریں اس تلاش کا عمل تاریخ کے بغیر نامکمل ہے۔

تاریخ کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی پہلے تھی، انگریزوں نے جن ممالک پر حملہ کیا تھا پہلے ان کی تاریخ اور زبان کا مطالعہ کیا تاکہ ان کی نفسیات سے واقف ہوں ان کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ جان سکیں ان کی مزاحمت کا طریقہ کار سے آشنا ہوں اور اِنہیں طریقے سے شکست دینی ہے اس کے اسباب اور علت پر توجہ دے سکیں اس کے علاوہ اس خطے کی آب و ہوا موسم اور وہاں کے راستوں سے باخبر ہوں ان کے طور و اطوار، رہن سہن، طرزِ حکمرانی اور نظامِ ریاست پر پوری معلومات جمع کر سکیں یہ تاریخی کتابوں اور سفر ناموں کے توسط سے ممکن ہو سکا کیونکہ تاریخ صرف خطے کی جغرافیائی حدود و اربع کی کہانی نہیں ہوتی بلکہ قوموں کے سوچنے، سمجھنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ہم تاریخی تصنیفات کے ذریعے سے کسی بھی قوم کی جامع اور مکمل معلومات حاصل کر سکتے ہیں لہذا انہی تاریخی کتابوں کی بدولت ہم عرب مترفات اور دیگر اقوام کی تہذیبی و تمدنی ثقافت سے روشناس ہو سکتے ہیں اور تاریخ کی بدولت انسانی ترقی، تنزلی، اقدامات اور احکامات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہزاروں سال قبل یونانی حکما کی تصنیفات سے اس دور کی معاشی، فکری، سماجی اور اخلاقی روایت کا علم تاریخ کے ذریعے سے ہو سکتا ہے

الغرض تاریخ ہی قوموں کی شکست اور ریخت کی حقائق کو منکشف کرنے کا درست اور کامل طریقہ ہے۔ نیز تاریخ کے مطالعے، ارتقاء، علوم، مذاہب وعقائد کی جامع معلومات ملتی ہیں۔

تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ یہ عہدِ حاضر میں قوموں کی رہنمائی کرتی ہے اور بیشتر اقوام کی خامیاں، غلطیاں اور قیاس کو واقعات کے حقائق پر پرکھتی ہے۔ آغاز میں تاریخ صرف واقعات پر مشتمل تھی اب تاریخ ایک سائنس کی شکل وصورت اختیار کر چکی ہے نیز تاریخ گزرے ہوئے واقعات، حالات اور بادشاہوں کا قصہ نہیں ہے بلکہ نوع انسانی کی تہذیب و تمدن کی کہانی ہے۔ اجتماعی انسان کی طرزِ فکر، ذہنی جودت اور جسمانی محنت و مشقت کی داستان ہے۔ جس میں حیران کن واقعات بھی ملتے ہیں اور سحر انگیز فتوحات بھی ہیں۔ لہذا تاریخ کی افادیت اور اہمیت اس لیے قابل قدر ہے کہ انسان اپنی روایات سے آشنائی کا قوی جذبہ رکھتا ہے۔ انسانی فطرت کے مظاہر کو سمجھنے کی تگ و دو کرتا ہے اور اس کدوکاوش میں اپنی ساری زندگی بسر کرتا ہے۔ انسان صرف عبادات اور خورد ونوش کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ فطرت کے مظاہر کو سمجھنے اور قدرت کے فیصلوں کو پرکھنے کے لیے بھی ہے اور فطرت کے انقلابات کو درست طریقے سے سمجھنے کے لیے تاریخ بہترین ذریعہ ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے تمام لوازمات کو سائنسی طریقوں پر استوار کیا جائے اور اس کے تمام جزئیات کو سائنسی طرز پر پرکھا جائے، روایت اور واقعات پر پہلوؤں سے جانچا جائے تاکہ درست نتائج نکل سکیں جس سے آئندہ نسل اپنے مستقبل کا درست طریقے سے راستے کا تعین کر سکیں۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ تاریخ اور شعبہ تاریخ کو جدید اصولوں پر استوار کیا جائے تاکہ اس شعبے کو بھی سائنس کی طرح تجربات، مشاہدات اور تجربے سے گزر کر ٹھوس نتائج اخذ کیے جائیں کیونکہ تاریخ کا مطالعہ دراصل اپنی ذات کی تشفی اور تکمیل کے مترادف ہے۔

۴۔ تہذیب کیا ہے؟

انسانی ارتقا کی تاریخ انتہائی طویل اور پرخار، پیچ دار مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ قدیم وحشی انسان کی ابتدائی زندگی کے نقوش علم بشریات کے ذریعے سمجھے جا سکتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس تلاش بسیار نے اس میں تخلیق کی صلاحیت اور مادے کو جنم دیا۔ ابتدائی انسان بن مانس سے مشابہت رکھتا تھا کیونکہ وہ غاروں میں زندگی بسر کرتا، شکار کرتا اور جانوروں کی کھال سے اپنے جسم کو ڈھانپ لیتا تھا۔ یہ ڈھانپنے کا عمل موسمی تھا جو بعد میں شعوری بنا۔ شکاری انسان نے جب زمین سے رشتہ جوڑا اور

بیج بو یا وہیں سے اس کی مادی زندگی میں انقلابات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ فصل اور زراعت نے اس کو پانی کے قریب آباد ہونے پر مجبور کر دیا۔ غار سے گھر تک کے سفر میں صدیاں بیت گئیں۔

سالہا سال جدوجہد اور جہد البقا نے انسان کو انسان بننے کا شرف عطا کیا۔ غیر مہذب سے مہذب بننے کا شرف، برہنہ سے لباس تک کا شرف شکار سے زراعت تک کا سفر طے کرنے میں انسان نے تہذیب کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ لہذا تہذیب محض مہذب ہونے تک محدود نہیں ہے بلکہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں مادی اور غیر مادی تصور اور مفہوم رکھتی ہے۔ جب ہم گفتگو کے دوران یہ کہتے ہیں کہ فلاں قوم تہذیب یافتہ ہے اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم مہذب ہے۔ اس کا رہن سہن، چال چلن اور طور واطوار شائستگی پائی جاتی ہے۔ لیکن جب یہی لفظ قدیم تہذیب کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تب اس کے معنی و مفہوم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ نیز ایک چیز عیاں ہے کہ تہذیب سے مراد یہ ہے کہ مہذب زندگی بسر کرنا ہے۔ عمارات اور شہروں کی تعمیر کرنا ہے۔ یعنی غاروں سے نکل کر شہر آباد کرنے کا عمل تہذیب کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں سبط حسن لکھتے ہیں کہ :

> کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کے طرزِ زندگی اور طرزِ فکر اور احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات، واوزار پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔[۱۴]

سبط حسن نے بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کو تہذیب قرار دیا ہے۔ جبکہ دیگر چیزوں کو مظاہر میں شامل کیا ہے۔ نیز انسان نے معاشرے کی بنیاد رکھنے کے بعد تہذیب کی جانب رجوع کیا۔ کیونکہ معاشرہ تبھی معرضِ وجود میں آیا جب انسان نے اپنی بقا کی خاطر مل جل کر رہنا شروع کیا، اس میں میل جول کی وجہ سے زبان بھی تخلیق ہوئی اور معاشی مفادات بھی طے ہوئے۔ اشیاء کی لین دین نے معاشرے کی نئی اکائی کو جنم دیا۔ جس کو معاشیات کہتے ہیں اور مال و مکاں کے مدِ نظر چند قوانین بھی مرتب ہوئے۔ خواہ وہ اصول تحریری نہ بھی ہوں لیکن اصول بنے لازم تھے۔ لہذا تہذیب کی ضرورت کیوں ہوئی، یہ سوال ابھی بھی تشنہ ہے کہ

> وہ کون سے عوامل تھے جس نے انسان کو شہر آباد کرنے کے لیے اکسایا یا تحرک دی۔ اس کی وجہ موسمی اور فطرتی قوانین میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ نیز تہذیب عربی زبان

کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی کسی درخت کو کاٹنا یا چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھونٹیں۔ فارسی میں تہذیب کے معنی آراستن پیراستن، پاک و درست کردن و اصلام نمودن ہیں اور اردو میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[۱۵]

اور یہ تمام معنی غیر مکمل ہیں۔ لہذا تہذیب صرف تراش خراش، کانٹ چھانٹ تک محدود نہیں ہے اور نہ ہی محض شائستگی سے اس کی تشفی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک خاص زمان و مکان عہد میں انسان کا شہر قائم کرنا، اس کی نظم و نسق اور نظام کو ترتیب دینا بھی شامل ہے۔

انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے سویلائزیشن Civilization کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ سویلائزیشن کا ترجمہ تہذیب کیا جاتا ہے۔ جو عربی اور فارسی مفہوم کا اعادہ کرتا ہے۔ اس لیے تشفی بھی نہیں ہو رہی ہے۔ نیز سویلائزیشن لاطینی زبان کا لفظ ہے جو Civil سے مشتق ہے جس کے معنی Citizan یا شہری کہلاتا ہے۔ اور City بھی اسی لفظ سے تعلق رکھتا ہے۔ سویلائزیشن لفظ کا استعمال انیسویں صدی میں رائج ہوا ہے اور اس تناظر میں استعمال کیا گیا ہے کہ وہ تاریخی عہد جس میں انسان نے ترقی یافتہ صورت اختیار کی یہاں ترقی یافتہ معاشرتی صورت میں استعمال کیا گیا

> The term civilization could be used as it was by Tylor, to refer to the total acvhivement of most advanced people to dale as if civilization were a unilinver devlepment out of the past with lesser people at different stages of the development.[۱۶]

یعنی تاریخ کا وہ لمحہ جس میں عہد گزشتہ سے ہٹ کر نئی اور جدید ترقی کی جانب پیش رفت کی گئی ہو خواہ اس ترقی میں کثیر نہ سہی لیکن قلیل لوگوں نے حصہ لیا ہو وہی تہذیب کی اساس بنتی ہے اور یہ ترقی مختلف مراحل طے کرتی گئی۔ ایک جانب عمارات کی تعمیر و ترقی، دوسری جانب زبان کا پختہ ہونا فنونِ لطیفہ کا پروان چڑھنا، معاشی رشتوں کو اس دور کی جدت پر استوار کرنا اور نئی عادات و نظریات کے لیے راستہ ہموار کرنا ہی تہذیب کے زمرے میں آتا ہے۔ تہذیب محض مادی ترقی سے عبارت نہیں ہے بلکہ روحانی، اخلاقی اور عقائد

سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ لہذا یہی اجزا مل کر نئے انسان کو تخلیق کرنے میں معاونت کرتے ہیں لہذا اس کی مزید واضح تعریف ملاحظہ ہو:

> Civilization is that kind of writing the Precence of cities and wide political organization and the development of occupational specializaiotn.(۱۷)

یہاں پر برٹینکا نے اس عہد کی فکر و نظریات کو بھی آشکار کیا ہے اور اس کے ساتھ منظم نظام سیاست اور ریاست اور پیشہ ورانہ کام کو بھی اولیت دی ہے۔ چنانچہ شہروں کو آباد کرنا اس کا نظم و نسق چلانا، مہذب رہن سہن اپنانا اور اعلیٰ ادب تخلیق کرنے والا عہد ہی تہذیب کہلاتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں مصری تہذیب، سندھی تہذیب وغیرہ۔

تہذیب کے لغوی معنی سویلائزیشن کی تشفی نہیں کرتی لیکن اصطلاحی معنی جامع مفہوم رکھتی ہے کہ مخصوص زمان و مکان میں کسی قوم یا گروہ کی زبان، رہن سہن، عادات واطوار، فنون لطیفہ، رسم ورواج اور ہنر، پیشہ وارانہ کام کا مجموعہ ہے۔ جو اس قوم یا گروہ کو مہذب بنانے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ جس میں فنون لطیفہ کو بھی عمل دخل ہے۔ چنانچہ سویلائزیشن کا درست اور مترادف لفظ تمدن ہے۔ جس کو ہم ان معنوں میں استعمال کر سکتے ہیں کہ حیوانیت، وحشت و بربریت کے مقام سے بلند ہو کر حیات کے مختلف شعبوں اور فنون میں رہبری اور رہنمائی کرنا ہے اور ان کے توسط و معرفت سے انسانیت کے معیار کو مزید بلند کرنا ہے کہ اس میں سے دور جاہلیت اور دورِ وحشت کی تمام برائی و خرابی ختم ہو جائے۔ تمدن کے دو ہی معنی و مفہوم جنم لیتے ہیں۔ ایک متمدن اور مہذب ہونے کا طریقہ و سلیقہ اور قرینہ دوم انسانی معاشرے کا ترقی یافتہ حالت میں پروان چڑھنا کے ہیں۔ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ تہذیب کا درست مترادف تمدن ہے جو سویلائزیشن کے معنی کا احاطہ و اعادہ کرتی ہے اور تہذیب کلچر کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر نے تہذیب کے عناصر ترکیبی میں تین اجزا کو شامل کیا ہے۔ جغرافیائی عناصر حیاتیاتی عنصر اور نظریاتی عنصر اوغام سے ہی تہذیب تشکیل پاتی ہے۔ نیز ول ڈیورانٹ نے تہذیب کے چار عوامل گنوائے ہیں اول معاشی عوامل دوم سیاسی عوامل، سوم اخلاقی عناصر اور ذہنی عوامل۔ اگرچہ دو مضامین کا طاہرانہ مطالعہ کیا جائے تو نگار سجاد نے اہم عنصر معاشیات کو فراموش کر دیا ہے۔

اور ول ڈیوارئٹ نے فنونِ لطیفہ کو ذہنی عوامل میں شمار کیا ہے اور خاندان، مذہب، عقائد اور سماجی و جنسی اخلاقیات کو اخلاقی عناصر میں شمار کیا ہے۔ نیز بعض فلسفوں نے تہذیب کا ارتقائی نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ حالانکہ انسان کی تخلیق و تشکیل کے ساتھ ہی ارتقا کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لہذا تہذیب شہری زندگی کی متقاضی ہے۔ اس لیے دنیا کی تمام تہذیب یا تمدن وہیں پر آباد ہوئیں جہاں پانی یا دریا بہتا ہے۔ کیونکہ پانی سے زراعت کو تقویت ملتی ہے جس سے خوشحالی جنم لیتی ہے اور یہی خوشحالی نت نئے شہر آباد کرنے کی صلاحیت اور خوبی رکھتی ہے نئے نئے تصورات، خیالات، اور نظریات کو ایندھن فراہم کرنے میں معاونت کرتی ہے جس کی بدولت اقوام ترقی کی منازل طے کرتی رہتی ہے۔ روحانی اور مادی ترقی بھی معاشیات سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔

سبطِ حسن نے اوزار کو اس لیے اہم قرار دیا ہے کیونکہ یہ محنت و مشقت کا ذریعہ ہے۔ ایک خاص اور مخصوص عہد میں دیہات سے شہر آباد کرنے والا عمل ہی تہذیب و تمدن کی بنیادی اساس ہے۔ تہذیب بیک وقت مادی و غیر مادی تصورات و نظریات کا مجموعہ ہے۔ دونوں میں کسی ایک کو نظر انداز کرنا غلط فہمی کو جنم دے گا۔ چنانچہ جو تہذیب و تمدن کو محض غیر مادی سمجھتے ہیں وہی غلطی پر ہیں اور جو محض مادی قرار دیتے ہیں وہ بھی درست نہیں ہیں۔ نیز تہذیب وہ ادارہ ہے جہاں کلچر، ثقافت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے حالات موزوں بتائے جاتے ہیں تہذیب و تمدن اگر درخت ہے تو ثقافت اس کی شاخیں اور ٹہنیاں ہیں۔

۵۔ تہذیب و ثقافت کا فرق:

انسان وہ واحد ہستی ہے جو فہم و ادراک رکھتا ہے جبکہ حیوانات میں بھی سوجھ بوجھ ہوتی ہے لیکن وہ محض حیلی حد تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی فہم و فراست انتہائی وسعت کی حامل ہوتی ہے۔ انسان کا وجود دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ایک جسمانی عمل اور رد عمل دوم سوچنا، فہم و ادراک کرنا شامل ہے۔ اسی طرح ثقافت بھی عمل سے تعلق رکھتی ہے یعنی اس کا اظہار مادی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ چنانچہ:

> ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ ث ق ف ہے۔ ثقافت کے لغوی معنی زیرک اور سبک و چالاک ہونا، کلام کو جلدی سمجھ لینا اور نیزوں کو سیدھا کرنا۔ اسی سے رحم مثقف آتا ہے یعنی سیدھا کیا ہوا نیزہ۔[۱۸]

موصوف نے ثقافت کی لغوی تشریح پیش کی ہے جس میں کسی شے کو درست و ترتیب دینا مراد ہے۔ نیز ثقافت تہذیب سے الگ تھلگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ تہذیب و ثقافت اور تمدن ایک دوسرے سے اتنے ملے جلے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ قرار دینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ حالاں کہ کئی محققین نے

انہیں الگ تھلگ جزئیات میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے لیکن کل میں ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہی قرار دیا ہے۔ تہذیب و تمدن کا مہذب پن سے تعلق ہے اور ثقافت خارجی عوامل، رہن سہن، طور و اطوار، اخلاقیات، عقائد سے عبارت ہے۔

تہذیب مخصوص عہد کی پیداوار رہی ہے جبکہ ثقافت تغیر پذیر اور ارتقاء پذیر ہے اور تہذیب ثقافتی اقدامات اور حرکات و سکنات کا گھوراہ ہے۔ تہذیب وہ زرخیز زمین ہے جہاں ثقافت کے بیج کو بویا جاتا ہے۔ وہ بیج نمو پاتا ہے۔ اس کی کونپلیں نکلتی ہیں، ٹہنیاں پروان چڑھتی ہیں۔ ان ٹہنیوں پر سبزہ نمودار ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کے پتے، پھول ار میوے جنم لیتے ہیں اور ان کی خوشبو، رنگ، نمو اپنی انفرادیتاور یگانگت کے باوجود زمین سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ الغرض ثقافت گروہ یا قوم کے فکری ارتقاء کے عملی مظاہر سے تعلق رکھتی ہے اور تہذیب اپنے جوہر میں آفاقی ہونے کے باوجود زمان و مکان کے قوانین میں تیر رہی ہوتی ہے۔ جبکہ ثقافت لہروں کی طرح بہتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

> تہذیب اور ثقافت (کلچر) ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ثقافت تخلیقی رخ ہے اور تہذیب تقلیدی رخ۔ ثقافت، فنونِ لطیفہ، سائنس کی دریافتوں اور ایجادات کے علاوہ عام زندگی میں اپج، تنوع، اور روحانی یافت کی صورت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ تہذیب مزاجاً رجحان، نقل کے تابع ہے۔ ماڈل کے مطابق مصنوعات تیار کرنا اس کا وظیفہ حیات ہے۔[۱۹]

ڈاکٹر نے جو موازنہ کیا ہے اس میں ابہام ہے بلکہ تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں تک درست ہے کہ تہذیب انسانی تاریخ اور ارتقائی عمل کا ایک خاص اور مخصوص عہد تھا جب انسان نے شہر آباد کرنے کی داغ بیل رکھی، جس عمل کو تہذیب و تمدن سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نیز اسی تہذیب و تمدن نے ثقافت کو فروغ دیا اس کی ترقی و تعمیر کے لیے راہ ہموار کرتی رہی۔ پھر تہذیب کس طرح سے تقلیدی ہو گئی؟ ایک ہی تہذیب، ایک سے زیادہ ثقافتوں کو جنم دیتی ہے اور اس کو پروان چڑھاتی ہے۔ بہر حال انسانی معاشرہ مکمل اکائی اور وحدت رکھنے کے باوجود ارتقاپذیر رہتا ہے۔ اپنے ارتقائی مراحل اور اسباب سے اگر جزئیات سے الگ الگ کر کے دیکھیں گے تب مظاہر اپنے اصل جوہر میں نمودار نہ ہو سکیں گے اور یہی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ بہر حال انگریزی میں ثقافت کے لیے کلچر Culture استعمال کیا جاتا ہے۔ جو اصل میں لاطینی زبان کے لفظ Cultas سے مشتق ہے۔ ماہرِ

عمرانیات نے کلچر یا ثقافت کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔اس ضمن میں ٹائلرTylor نے اپنی شہرہ اقاق تصنیف "ابتدائی قدیم کلچر" میں ثقافت کی تعریف یوں بیان کی ہے:

> کلچر (ثقافت) وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو جو معرفت و علم پر مشتمل ہیں۔ یعنی فکر و عقیدہ فن (آرٹ) اخلاق، قانون، رواج اور دوسری وہ تمام انسانی عادتیں اور تمام فطری صلاحیتں جنھیں معاشرے کا ممبر اور معاشرہ کا رکن ہونے کی حیثیت سے انسان اکتساب کیا کرتا ہے۔[۲۰]

ثقافت اپنی مائیت میں مادی اور ظاہری اشیا پر محیط ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے کی صلاحیت اور خوبی بھی رکھتی ہے۔ بلکہ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ تہذیب دوسری نسل میں منتقل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی یا اکتساب نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ثقافت میں یہ پہلو پوشیدہ ہے کہ یہ منتقل بھی ہوتی ہے اور سیکھی بھی جا سکتی ہے۔ جیسے کوئی اردو زبان سیکھتا ہے تب وہ زبان کی ثقافت، طور و اطوار سے بھی روشناس ہوتا ہے جبکہ تہذیب مخصوص عہد کی پیداوار تھی اور اس عہد تک محدود رہی نیز ثقافت کی ترقی و تعمیر میں تہذیبی نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں۔اس کی واضح مثال لوگوں کے ساتھ میل جول، برتاؤ، اخلاقی اقدار، فکری و نظریاتی گوشوں کے ساتھ فنون لطیفہ، آرٹ وغیرہ کو بھی عیاں کرتا ہے۔

سر سید احمد خان نے تہذیب کو درست معنوں میں استعمال کیا ہے جو مغرب میں بھی رائج تھا۔ ہمارے یہاں فارسی اور عربی کے معنوں میں تہذیب اور ثقافت کو برتا گیا ہے اور یہی غلطی ہنوز جاری ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ خود کو زندہ رکھنے کے لیے فطرت کے پہلو بہ پہلو ایک نئی معروضی دنیا کو تخلیق کرتا ہے۔ کام کرتا ہے، روزگار کے وسائل پیدا کرتا ہے۔ اوزار کو تخلیق کرتا ہے۔ دنیا کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور اس کو نو بہ نو تبدیل بھی کرتا رہتا ہے۔

اسی جہد اللبقا کے دوران تہذیب و ثقافت کو بھی پروان چڑھتا رہتا ہے۔ چنانچہ تہذیب خالص انسانی تخلیق ہے اور انسان ہی اس کا ضامن ہے۔ لیکن تہذیبی عوامل یا جراثیم ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی جبلی طور پر تہذیبی عمل میں شریک ہوتا ہے۔ انسان کا بات چیت کرنا۔ آلات کا استعمال کرنا اپنے سماجی و اخلاقی فرائض کو ادا کرنا معاشرے سے ہی سیکھتا ہے اور یہی اکتساب کا عمل ثقافت کہلاتا ہے۔ ہر چند کہ تہذیب کی اساس انسان کی جسمانی ساخت پر ہے لیکن اس کا کردار غیر جسمانی ہے اور ثقافت کا کردار جسمانی نوعیت کا ہے۔ تہذیب کو ایک نسل سے دوسری نسل میں جسم کے ذریعے منتقل نہیں کیا جا سکتا لیکن ثقافت کو طور و اطوار

کے معرفت سے اکتساب کیاجاسکتا ہے۔ نیز تہذیب کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے۔ جو کئی معاشرت کی ثقافت کا مجموعہ ہے۔ ثقافت گھروں کی ہئیت، ساخت، تعمیر، گلی کوچوں کی ہئیت، ساخت زبان و بیان، تکلم و اسلوب، لباس، رہن سہن، بازار کی ترتیب، شہریوں کے کھانے پینے کا طرز، مزاج، سجاوٹ و زیبائش وغیرہ جن کا تعلق انسان کی حس و جمالیات سے ہے۔ یہ تمام پہلو اور گوشے ثقافت کے زمرے میں آتے ہیں۔ تہذیب کی حد متعین نہیں ہوتی کیونکہ یہ دریا کی طرح وسعت اور گہرائی رکھتی ہے جب کہ ثقافت خطوں میں منقسم ہوتی ہے تاہم تہذیب اور ثقافت کے درمیان اختلاف واشتراک کی وضاحت ساجد امجد نے یوں کی ہے کہ:

> کلچر ایک نقطہ نگاہ کا نام ہے اس کا عملی اظہار تہذیب ہے، کلچر صرف زہن کا عمل ہے اور تہذیب ذہنی تصورات اور خارجی اعمال اور ہر دور کا مجموعہ۔ ثقافت، تمدن اور کلچر خاص ہیں۔ ثقافت کا تعلق علوم وفنون سے ہے تمدن کا عمارت و باغات سے ہے کلچر کا وانش، ذہنی تصورات او ایمانیات سے جبکہ تہذیب ایک عام چیز ہے ان تینوں پر حاوی۔[۲۱]

ڈاکٹر صاحب نے ثقافت، تمدن اور کلچر کا موازنہ کرنے کے بعد تہذیب کو ایک عام شے مانتے ہوئے غالب قرار دیا ہے جبکہ غیر معمولی شے میں غالب ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تاہم تہذیب کی تخلیق سے قبل بھی انسان زندگی بسر کرتے تھے ان کے وحشی طور واطوار کو ثقافت یا کلچر قرار دیا جاسکتا ہے۔ پس اس سے یہ معلوم ہوا کہ ثقافت، کلچر کو فروغ دینے میں تہذیب کا کلیدی کردار ہے۔ سوچ کے نئے زاویے، نئے گوشے اور نئی سمت تہذیب نے فراہم کیے ہیں۔ نیز تمدن شہر آباد کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ جو تہذیب کا مادی اظہار ہے جب کہ بعض محققین کے یہاں انسان کا بڑے بڑے گروہوں میں مل کر ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنا تمدن کہلاتا ہے۔ گو کہ جس نظام کے تحت زندگی گزارتے ہیں اس کو بھی کوئی نام اگر دیا جائے تو وہ تہذیب ہی ہو سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب ایک وسیع اصطلاح ہے اور ثقافت و تمدن اس کے جزئیات ہیں۔ بلاشبہ ثقافت اور تمدن کے بھی کئی جزئیات اور اجزا ہیں لیکن اس کا اصل مرکز تہذیب ہی ہے۔ جس کے زیر سایہ وہ تمام اجزا اور جزئیات پروان چڑھتے ہیں جس کو تمدن ثقافت وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں انوار ہاشمی لکھتے ہیں:

> تہذیب ایک وسیع لفظ ہے اس میں انسان کی زندگی کے بنیادی تصورات، عقائد وافکار، زندگی کا نصب العین اور تمام افعال ارادی جس میں انسان کا چلنا، پھرنا، اندازِ گفتار،

کردار، اخلاق و آداب و اطوار اس کے عمل ادبی سائنسی و ثقافتی کارنامے اس کی سیاست
معاشرت اور معیشت سب شامل ہیں۔ تہذیب نام ہے ترقی کا مادی ترقی اور روحانی
ترقی دونوں کا جزولاینفک ہیں۔[۲۲]

ان کی تعریف تہذیب کا مکمل احاطہ اور اعادہ کرتی ہے کہ مادی، غیر مادی ترقی بھی تہذیب سے تعلق رکھتی ہے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی خطہ تہذیبی طور پر ترقی یافتہ ہو مادی ترقی میں پیش ہو۔ لیکن وہاں روحانی ترقی ناپید ہو۔ روحانی ترقی اور نشو نما کے لیے مادی ترقی ناگزیر ہے۔ جہاں معاشی آسودگی ہو وہیں پر فنون لطیفہ کی ترقی کے امکانات روشن ہوں گے۔ لہذا تہذیب وہ ہیولا ہے جہاں ثقافت۔ تمدن کی ترقی کے امکانات پروان چڑھتے ہیں، بن مانس اوزار تخلیق یا استعمال کرنے کے باوجود تہذیب کا ضامن نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ مکمل اور جامع تخلیقی عمل ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب پن کی نشاندہی کرتا ہے یہی تہذیب، ثقافت کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے تہذیب میں یہ نقص ہے کہ وہ مان و مکان میں مقید رہتی ہے۔ وہ حالات کے ساتھ خود کو تبدیل نہیں کرتی جبکہ اسی کے توسط سے نشو نما پانے والی ثقافت تغیر پذیر ہے۔ وہ خود کو فطرت کے قوانین میں ڈھال لیتی ہے اور تنوع پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

ہم ثقافت کی جامع تعریف یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ثقافت کسی شے یا انسان کی جسمانی و ذہنی نشو نما اور ترقی کہلاتی ہے۔ نیز عام اظلاح میں ثقافت سے مراد انسان کی ذاتی و اجتماعی نشو و نما کے تمام تر پہلوؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے کسی معاشرے کے شہریوں کے عقائد، علم، رہن سہن، خیال، چلن، رسم و رواج، رسومات و روایات، زندگی کے دیگر تمام گوشے، لین دین، کاروبار، حرکات و سکنات کو یکجا کر کے ثقافت کہا جاتا سکتا ہے۔ ثقافت ہی کسی گروہ یا قوم کی پہچان یا شناخت ہوتی ہے۔ ثقافت اس قوم کی وہ مشترک اقدار ہیں جن سے نہ صرف فرد واحد کی شناخت ہوتی ہے بلکہ دیگر سماج سے الگ تھلگ طور پر پہنچانی جاتی ہے۔ نیز ثقافت فرد کی مکمل تشکیل نو کرتی ہے جو حس جمالیات، ذہانت اور روشنی کو مرتب کرتی ہے۔ ثقافت ترقی اور کمال کا دوسرا نام ہے نیز یہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ یہی بنیادی فرق تہذیب اور ثقافت میں ہے۔

(ج) مصری تاریخ و تہذیب:

دنیا کی قدیم اور عظیم تہذیبوں میں مصری تہذیب اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے عجائبات میں اہرام مصر شامل ہے۔ یہ عظیم الشان تعمیرات دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتی ہے۔ یہ جتنی پرانی

تہذیب ہے اس کی تاریخ بھی اتنی ہی پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ اس میں تضادات اور اساطیری کرداروں کی فہرست بھی اتنی ہی طویل ہے۔ یہ خطہ دریائے نیل کے پاس قائم ہے اور دریائے نیل کے توسط سے یہ آباد ہوتا ہے یہاں کی زرخیزی کا اندازہ اس کی تہذیب کے گوناگوں پہلوؤں سے لگایا جا سکتا ہے۔ الغرض مصری تہذیب و تمدن اپنے عہد کی نمائندہ تہذیب تھی۔

تاریخ کے ابتدائی ادوار میں انسان غاروں سے نکل کر دریا کے کنارے آباد ہونا شروع ہوئے تھے۔ اس عہد کا انسان ابھی فطرت کے ہاتھوں بے بس اور لاچار تھا۔ اس کا سارا انحصار فطرت پر تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے فطرت کو تسخیر کرنا شروع کیا اور غاروں کو دیکھا دیکھی گھر بنانے کی بنیاد رکھی۔ وہ ابھی بھی دیوتاؤں کا پوجا ری تھا اور جانوروں سے خائف رہتا تھا۔ اس لیے اپنے قبیلے کی علامت جانوروں کی خصوصیات یا اشکال پر رکھتا تھا۔ چنانچہ طوفانِ نوح کے بعد تاریخ نے نئی کروٹ لی اور مختلف مقامات پر آبادی کے تصور ابھرنے لگے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے دو بیٹے تھے ایک حام اور دوسرے اسام تھے۔ مصری قوم کا تعلق حام قوم سے جوڑا جاتا ہے بلکہ فرعون کے خاندان کا نسب حام سے کیا جاتا ہے۔ فرعون قدیم مصری بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔

فرعون عبرانی زبان کا لفظ فاروPharoh کا مقرب ہے۔ فارو مصری لفظ فرا (بہ معنی سورج دیوتا) کا بگڑا ہوا روپ ہے۔(۷)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصری بھی دیگر اقوام کی طرح ابتدائی عہد میں دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور دیومالائی کرداروں پر یقین رکھتے تھے اور رفتہ رفتہ فرعون نے بادشاہت کی صورت اختیار کر لی اور خود کو دیوتا کی اولاد کے طور پر پیش کرنے لگا۔ اس ضمن میں سبطِ حسن لکھتے ہیں:

مصر کے فراعنہ اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں دیوتا اور دیوتا کی اولاد خیال کرتے تھے۔(۸)

یہ اس دور کی یادگار ہے جب انسان زرعی انقلاب سے کوسوں دور تھا اور پتھر کا زمانہ تھا چنانچہ مصر میں آمون کو بڑی اہمیت حاصل تھی یہاں تک کہ فرعون کی بیوی شادی کی پہلی رات مندر میں جاتی تھی اور آمون دیوتا اس سے مباشرت کرتا تھا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک وہ حاملہ نہیں ہو جاتی تھی۔ اس لیے بھی فراعنہ خاندان خود کو دیوتا یا دیوتا کی اولاد کہلاتا تھا۔ ابتدائی عقائد میں یہاں کے لوگوں کا دیوتاؤں پر قوی یقین تھا اور اس کی جگہ فراعنہ خاندان نے لے لی۔ یہ خاندان کم و بیش ۱۸۰۰ میں مصری لوگوں پر حملہ آور ہوئے اور یہاں کے مقامی باشندوں کو شکست دیتے ہیں۔ انہیں مارتے ہیں قتل و غارت گری کرتے ہیں اور پھر مصر کے

حاکم بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہیں کے ہو جاتے ہیں۔ چونکہ مصر دریائے نیل کے کنارے پر آباد ہے اس لیے ڈیلٹاوالا علاقہ سرسبز اور خوشحال تھا، غلہ بانی کی بہتات تھی اور ڈیلٹا کے علاوہ دوسرا علاقہ صحرا اور ریت سے بھرا ہوا تھا۔ نیز دریائے نیل کی طغیانی بھی مقبول رہی ہے۔ لیکن قدرت کا خاص تحفہ ہے جس سے تہذیب کی داغ بیل رکھنے میں معاونت کی بہر حال تہذیبوں کی بنیاد رکھنے میں دریا کا کلیدی کردار رہا ہے وہ دجلہ فرات کا کنارہ ہو یا سندھ دریا کا کنارہ ہو۔

مصر بھی دیگر خطوں کی طرح حملہ آوروں کی زد میں رہا، لیکن اس کی تاریخ تین خاندانوں کے گرد گھومتی ہے جو یک بعد دیگرے برسراقتدار رہے۔ قدیم خانوادہ (۳۴۰۰۔۲۴۷۵ ق م) سے (۲۴۷۵۔۲۱۲۰ق م) کے دوران ایشیائی طاقتوں کی یورش کی وجہ سے ملک میں افراتفری اور انتشار کا زمانہ تھا لہذا:

مصرِ قدیم کا آخری دور شان و شوکت سے اندازاً ۱۵۷۰ قبل مسیح میں شروع ہوا۔[۹]

اس کے بعد یہ عظیم الشان سلطنت بن گئی۔ بہترین نظم و نسق قائم ہوا اور دیگر خطوں کو بھی فتح کر کے مصر کا حصہ بنایا گیا۔ اس عہد کے یادگار اہرام مصر ہیں، مصر پر اس کے بعد تقریباً تیس خاندانوں نے حکمرانی کی۔ تاریخ کے نشیب و فراز دیکھیں اس خطے میں حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف کا قصہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ مصری حام کی قوم میں سے تھے اس لیے بنی اسرائیل سے ان کی دشمنی انتہائی پرانی اور تاریخی رہی ہے بلکہ انھوں نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، اس کی ایک طویل داستان ہے۔

تاریخی واقعات اور شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مصر کے پہلے فرعون کا نام: سن فیرو" تھا اور اس کے علاوہ چوپس فقرا، میکورا، پینیتی دوم ہتشنیت، سیتی اول اور رامس دوم نے تاریخ پر اپنے نقش چھوڑے ہیں جبکہ رامیس دوم کے عہد میں بنی اسرائیل پر مصائب کا لامتنائی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور وہ بالآخر مصر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مصری حکمران جس کو فراعنہ کہتے ہیں تخت نشین ہوتے ہی اپنا مقبرہ (ہرم) بنوانا شروع کر دیتا تھا جو مخروطی شکل میں ہوتے ہیں۔ لہذا یہ اہرام دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مختلف فراعنہ نے طویل مدت تک حکومت کی ان میں سے اخناتون، ہوریم ہب، سیتی اول، ٹھوتیمس سوم، امن ہوتب دوم، امن ہوتپ سوم، حنابشہ، رامس دوم، توت آنکھ آمن، خونو، رامس می آمن، قابل ذکر ہیں اور اس کے علاوہ بطلیموس بھی فرعون بنے تھے۔ حالانکہ اس کا تعلق سکندر مقدونی سے تھا۔ یہ سکندر مقدونی کے سپہ سالار تھے اور ان کی وفات کے بعد حکومت کے چار حصے کیے گئے۔ مصر بطلیموس کے حصہ میں آیا تھا۔

یہ ۳۰۶ قبل مسیح میں مصر کا خود مختار بادشاہ بن گیا۔ یہ مصر کا چودھواں سلسلہ شاہی تھا۔
اس خاندان نے ۳۲۳ قبل مسیح سے ۳۰ قبل مسیح تک مصر پر حکومت کی اسی دور کو عہد
بطلیموس کہا جاتا ہے۔(۱۰)

اس خاندان کے بانی بادشاہ نے مصر کو بھرپور ترقی دی اور اسکندریہ کو دارلسلطنت مقرر کیا، جس کی وجہ سے یہ شہر تجارت کا مرکز بنتا گیا اس نے ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کروایا۔ جہاں یونان اور دیگر حکماء کی نایاب کتابیں موجود تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسکندریہ مقدومی کی معرکہ آرائیوں پر خود ایک کتاب تحریر کی تھی لیکن وہ وقت کی دھول میں کہیں گم ہو گئی۔ اس نے اپنی محنت اور جدوجہد سے مصر کو خوب ترقی دی۔ اس لیے وہ اپنے وزرا سے بھی الجھتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا، بطلیموس لاگوس کی جگہ اس کا بیٹا بطلیموس فلاڈل خود سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ امن پسند اور رحم دل تھا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح علم وادب سے دلچسپی تھی۔ اس نے تورات کا عبرانی سے یونانی زبان میں ترجمہ کروایا۔ اس نے ایک روشن مینار بھی تعمیر کروایا تھا۔ جہاں اس میں امن پسندی، رحمدلی اور علم روشنی تھی وہاں پر یہ عیش پرستی کی بھی اعلیٰ مثال ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنی سگھی بہن سے شادی کی رسم ڈالی تھی اور اس عمل پر دیگر شہروں میں بھی اپنی بہنوں سے شادی کی رسم سلسلہ سے شروع ہوا اور یہیں سے بہن سے شادی کی رسم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے بہن کو محبوب لکھا ہے۔

مصر کی تاریخ میں قلوپطرہ کا تذکرہ تو ملتا ہے۔ لیکن ایک عورت کا بادشاہ فرعون بننا حیرت کی بات ہے۔ ملکہ ہشت سی پشت مصر کی پہلی ملکہ تھیں جو فرعون بنی تھیں۔ اس نے بیس برس انتہائی شان و شوکت سے حکومت کی، اس نے حکومت میں اپنے شوہر کو بھی شرکت داری نہیں دی بلکہ خود مختاری سے حکومت کرتی رہی۔ چنانچہ مصریوں نے مرد روایت برقرار رکھنے کے لیے اس کی بت اور تصویریں ڈاڑھی کے ساتھ بناڈالیں۔ چنانچہ مصر پر فراعنہ خاندان کی حکمرانی حضرت عمر کے دور میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل قیصر نے بھی یہاں حکمرانی کی تھی اور ایرانیوں نے بھی اس خطے پر اپنی حکومت کے پنجے گاڑھے تھے۔

مصری تاریخ کی عجیب و غریب اور حسین ترین عورت کلوپڑا (قلوپترا) تھیں اس کا تعلق عہد بطلیموس خاندان سے تھا اور اس خاندان کے بارہویں بادشاہ فرعون کی بیوی تھیں اور یہ فرعون اس کے سگے بھائی تھے۔ قلوپترا نے اپنے ناز وادا سے قیصر اجولیس میزر کو بھی اپنا شکار بنا چکی تھی۔ قلوپترا سترہ سال کی عمر میں خاندانی رسم ورواج کے مطابق چھوٹے بھائی بطلیموس بارہویں کے ساتھ شادی کروادی گئی اور اس کے ساتھ مل کر اس

نے مصر کی حکومت کی لیکن دو سال کے بعد سرپرستوں نے بطلیموس بارہویں سے اقتدار چھین لیا تب وہ ملک شام کی طرف چلی گئیں وہ وہیں تھیں کہ اس کو پتہ چلا کہ جولیس میسرز بطلیموس کا پیچھا کرتے ہوئے مصر آئے ہیں۔ تب انہوں نے جولیس میرز کی دربار تک رسائی کے بہانے تلاش کیے اور خود کو ایک کپڑوں کے کھڑے میں بند کروا کے دربار تک پہنچی جب ملازم نے کپڑے کا گھڑا کھولا اس میں سے قلوپترا اپنے حسن و جمال کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں۔ اس کی حسن وادا کے سامنے قیصر بے بس ہوگئے اور اس کی خوب صورتی پر مبہوت ہوگئے۔

چنانچہ قیصر مصر میں ہی رہے اور قلوپترا کے ساتھ اچھا وقت گزارنے لگے۔ اس کے بعد پھر روم چلے گئے قلوپترا بھی ان کی ہمراہ تھیں۔ قیصر میں سے ان کا ایک بیٹا ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد واپس آئیں اور مصر کی ملکہ بن گئیں۔ قلوپترا نے انطوانی کو بھی اپنے جال میں پھنسالیا تھا۔ وہ کئی برس تک اس کی حسن و غمزے سے باہر نکل نہیں سکے تھے انطوانی نے قیصر کی بہن کو طلاق دے دی اور قلوپطرہ سے شادی کرلی۔ اس پر قیصر کو بہت غصہ آیا اور اس نے حملے کی تیاری شروع کر دی۔ ادھر سے کلیوپڑا اور انطوانی بھی جنگ کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ بڑی جنگ ہوئی کئی لوگ مارے گئے۔ قلوپترا وہاں سے فرار ہوگئیں اور انطوانی تک اطلاع پہنچائی گئی کہ قلوپترا ماری گئی یہ سن کر اس نے تلوار سے خودکشی کرلی اسی دوران قاصد کا پیغام ملا کہ قلوپترا انہیں شاہی گنبد میں بلا رہی ہیں۔ لہذا انہیں بستر مرگ پر شاہی گنبد لایا گیا۔ اپنی آنکھوں سے قلوپترا کو زندہ دیکھ کر تاب میں آئے لیکن زخم بہت گہرا تھا اور اس سے خون بہت بہہ چکا تھا۔ وہیں پر اس نے دم دیا اس کے بعد قلوپترا نے بھی خود کشی کرلی۔ اس کی خودکشی کے حوالے سے مسند حوالہ نہیں ملتا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ اس نے زہر پیا تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ اس نے سانپ سے خود کو ڈسایا تھا جبکہ اس کے پہلے شوہر کے حوالے سے بھی قیاس آرائیاں ہیں کہ اس نے دریائے نیل میں جان دی تھی۔

قلوپترا نے کل چار شادیاں کیں تھیں پہلی شادی خاندانی رسم کے مطابق بھائی سے کی تھی دوسری بار تیرہویں بادشاہ سے قیصر اور انطوانی کو اپنے دام میں پھنسایا اور ان سے شادیاں کیں اور دو دفعہ ملکہ رہیں ان کی شخصیت اور حسن میں عجیب جاذبیت تھی جو اس کو دیکھتا تھا اس پر مبہوت ہو جاتا تھا بہت ہوشیار، چالاک اور شاتر تھیں۔ اپنے حسن کو کہاں استعمال کرنا ہے اس ہنر سے اچھی طرح باخبر تھیں۔

رام یسیس نے تئیس سال حکومت کی اس نے تمام فوجی سپہ سالار اور مشیروں کو بلایا اور ان کو اپنے بیٹے کے ساتھ وفادار رہنے کا وعدہ لیا۔ اس کے چار سال بعد رام یسیس کی وفات ہوگیا اور اس کا جانشین انتہائی بزدل

اور ڈرپوک تھا اس لیے مذہبی پیشواؤں نے مندر پر قیمتی چڑھاوے شروع کر دیے۔ خزانہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ ملک میں بدامنی اور افراتفری کا دور شروع ہو گیا۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر تھیبس کے سب سے بڑے مہنت تختوں نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا اور فرعون کے اختیارات میں کمی کر دی۔ چنانچہ ایک ہی ریاست میں دو حکمران تھے۔ مہنت نختون کے بیٹوں نے بھی حکومت کی اور اس کے بعد پوتے کی باری آتی ہے۔ اس نے فرعون کے خاندان سے شادی کر لی تھی،۔

اس طرح مہنت ہری ہر کی شہزادے کے منصب پر رہے، مہنت مندر کے سربراہ ہوا کرتے تھے اور ان کی جانشینی کا حصہ بھی چلتا تھا۔ مصر کے فرعون اپنی ذات میں خدائی صفت بیان کرتے تھے، اس لیے مردہ فرعون کا تصور ہی نہیں ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد مخروطی تیر یعنی ہرم میں انہیں رکھا جاتا تھا۔ وہاں انھیں ممی کی صورت میں مصالحے اور دیگر مرکبات کے ذریعے حنوط کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حنوط کا طریقہ سب سے پہلے مصر میں ملتا ہے۔ سبط حسن نے اس پر تفصیل سے لکھا ہے کہ حنوط کے کتنے طریقے ہیں اور کس طرح مردہ کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔

عقائد کے حوالے سے مصر بھی دیومالائی دیوتا پر یقین رکھتا تھا اور یہ انسانی شعور کی انتہائی شکل تھی۔ اس کے تاریخی محرکات بھی رہے، ماہرین کا خیال ہے کہ یہ عمل ابتدائی وحشی یا غاروں کی زندگی سے چلا آرہا تھا، پھر رفتہ رفتہ دیوتا کی صورت اختیار کر گیا۔ مصری بھی سورج دیوتا کو متغیر تسلیم کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سورج کشتی میں سفر کرتا ہے اور ان کے یہاں موت کے بعد احتساب کا تصور بھی ملتا ہے۔ قدیم مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ تمام روحیں جسم سے آزاد ہو کر زمین کے نیچے اس مقام پر جمع ہوتی ہیں جہاں سورج ہر شام کو چلا جاتا ہے۔ اس جگہ کو مملک غزب کہا جاتا تھا اور اس جگہ پر آخرت کا دیوتا ازیرس حکومت کرتا ہے اور یہیں پر ازیرس دیوتا حساب کتاب کرتا تھا، چنانچہ بیالس بڑے گناہ کبیرہ کا احتساب ہوتا تھا اور اگر کسی نے یہ گناہ کیے تھے تو اس کو اس وقت تک کوڑے مارے جاتے تھے جب تک وہ پاک نہ ہو جاتا تھا، اس کے بعد دیوتا اس کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ اگر مصریوں کے اس عقیدہ کا جائزہ لیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ دیگر تہذیبوں کی طرح یہاں بھی موت کے بعد حساب کتاب کا اپنا تصور ملتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق روح انسان کے منہ سے باہر نکلتی ہے اور روح الگ وجود رکھتی ہے جبکہ جسم الگ وجود رکھتا ہے اور روح کو یہ لوگ "کا" کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مر جانے کے بعد زمین میں "کا" زندہ رہتا ہے اس لیے وہ مردے کے ساتھ تمام اشیاء دفن کرتے تھے لہذا ان کا خیال تھا کہ

روح ظاہری طور پر جسم کی طرح اور باطنی لحاظ سے خیال کی ہوتی ہے۔ اس کو چھونا ممکن نہیں کیونکہ خیال کو چھوا نہیں جا سکتا اور یہ مرنے کے بعد منہ سے نکلتی ہے اور ایک بار پھر بدن کی محتاج ہوتی ہے اور اگر جسم کو محفوظ نہ رکھا جائے تو یہ روح آوارہ پریشان گھومتی ہے۔[۱۲]

شاید یہی وجہ تھی کہ مصری مردے کو ممی بنایا کرتے تھے اس کے علاوہ ان کا عقیدہ تھا کہ انسانی جسم چار اجزا یا چیزوں کا مرکب ہے۔ اول نور، دوم خاک، سوم روح اور چہارم دیوتا کے سر سے نکلی ہوئی کرن حیات۔ ان چار اجزا سے انسانی جسم تخلیق ہوتا ہے۔ چونکہ مصری بت پرست تھے اس لیے ان کے یہاں کئی بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس کے لیے ان کے یہاں بت یا دیوتا کی پوجا کو عبادت تصور کیا جاتا تھا۔ جس کے لیے بڑے بڑے مندر بنائے جاتے تھے یا پہاڑوں کو تراش کر بت بنائے جاتے تھے یہ لوگ ایک سے زیادہ دیوتا کی پوجا کرتے تھے،

ان میں دیوی بھی تصور کی جاتی تھی۔ اس کی کسی بھی رائبہ کو شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی اور اگر کوئی شادی کرے تو اس پر عذاب نازل ہوتا تھا یہ دیوی دیوتا ازپرس کی بیوی اور بہن بھی تھی۔ اس دیوی کی مورت دو طرح سے بنائی جاتی تھی ایک میں حسین عورت اور دوسرا روپ یوں تھا کہ سر گائے کا ہوتا اور بقیہ جسم عورت کا بنا دیا جاتا تھا۔ دیوتا کو سورج کا متبادل تصور کیا جاتا تھا۔ اس کو پہلے "اتم" کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اس دیوتا کی پوجا فرعون اختانون نے لازمی قرار دیا تھا۔ لیکن پروہیتوں نے مخالفت کی تھی۔ جبکہ دیوی ایزس کے شوہر ازیرس دیوتا کو دریائے نیل کا مظہر تصور کیا جاتا تھا۔ اس دیوتا کو اس کے بھائی ستات نے دغا بازی سے قتل کیا تھا۔ تب دیوی ایزس نے اس کے جسم کے ٹکڑے تلاش کر کے اس کو زندہ کیا تھا اور یہ زمین کے نیچے چلے گئے تھے یہی دیوتا تمام لوگوں سے حساب کتاب کرتا تھا اور ایسے دیوتا کو آخرت کا دیوتا کہتے تھے جبکہ اس کا بیٹا بھی دیوتا مانا جاتا تھا۔ جس کو دیوتا ہورس کہتے ہیں۔ اس دیوتا کو صبح کے سورج سے منسوب کیا جاتا تھا اور باپ کا بدلہ لینے والا تصور کیا جاتا تھا اور ستات کو بدی یا شر کا دیوتا مانا جاتا تھا، نیز مصریوں کا سب سے قدیم اور پرانا دیوتا فنام تھا۔

مصریوں کا عقیدہ تھا کہ تمام دیوتا اس کی آنکھ اور انسان کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں اس کی تصویر اس طرح بناتے تھے کہ یہ دیوتا ہاتھ سے مٹی کے پتلے ڈھال رہا ہے اور اسکے دوسرے ہاتھ میں عصا ہوتا تھا جسے زندگی کی قوت اور دوام کا نشان تسلیم کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر دیوتاؤں میں دیوتا آمن جو خود مختاری کا دیوتا تھا۔ دیوتا نفتیس جو شر دیوتا کی بیوی اور مردوں کے دیوتا آلوپس کی ماں تھی، یہ آلوویس دیوتا ازہریس کا ناجائز بیٹا تھا،

اس دیوتا کا جسم آدمی کا اور سر گیڈر کا ہوتا تھا۔ دیوتا "توت" آکرت کے دیوتا نرریس کے ساتھ آخرت میں حساب کتاب کرتا تھا۔ اس کو گنتی ایجاد کرنے والا تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے بے شمار نقوش بھی موصول ہوئے ہیں جس میں اس کے ایک ہاتھ میں قلم دوسرے ہاتھ میں کاغذ ہے اور نیکیوں اور بدی کا حساب لکھ رہا ہے۔ چنانچہ ان کے علاوہ دیگر دیوتا بھی ہیں جن میں ثالوث دیوتا، بیس یا بوہو دیوتا، دیوتا تاتوت، دیوی مات، باخو سس، دیوی موت، دیوت نت، دیوتا خبیرہ اور دیوی سخ مت وغیرہ شامل ہیں۔ مصریوں کے یہاں بھی ہندوستانی اور یونانی دیوتاؤں کی طرح اچھائی، برائی، زندگی و موت، حسن اور بدی کا دیوتا اور دیوی ملتے ہیں، شاید یہ اس دور کا عام چلن تھا۔ اس لیے دیوتا اور دیوی کا تصور پروان چڑھا۔

مصری رسم الخط اشکال کی صورت میں ملتے ہیں۔ یعنی جانوروں کو تصویروں کی مدد سے تحریر کیا جاتا تھا، یہ انتہائی قدیم طریقہ ہے۔ لہذا مصری کھنڈرات میں اس کی بے شمار تحریریں ملتی ہیں۔ جبکہ وہاں پر کتب خانے کا تصور بھی ملتا ہے لازمی ہے کہ وہاں پر یونانی، عبرانی، سیرانی زبان کی تصنیفات موجود ہوں گی جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئی ہیں۔ مصریوں کے یہاں عبادت کے لیے گیت، بھجن پائے جاتے ہیں اس لیے یہ امکان غالب ہے کہ اس عہد میں شعر و ادب تخلیق کیا گیا ہے۔ جبکہ دیوتا ازیرس کی جدائی میں اس کی بہن اور بیوی نے بین بھی کی تھی، جو شاعری کی صورت میں موجود ہے۔

دیوتا تو اپنے گھر واپس آجا
تیرا کوئی دشمن نہیں ہے
اور حسین نوجوان مجھے دیکھنے واپس آجا
میں تیری بہن ہوں تو مجھ سے جدا نہ ہو
میرا دل تیرے لیے بے قرار ہے
اور میری آنکھیں تجھ کو ڈھونڈ رہی ہیں
اس کے پاس آجو تجھ سے محبت کرتی ہے
اپنی بہن کے پاس آ، اپنی بیوی کے پاس آ
دیوتا اور انسان سب تیرے لیے رو رہے ہیں
کہ میری آواز عرش تک جاتی ہے
مگر تو نہیں سنتا

میں تیری بہن ہوں جس سے تو محبت کرتا تھا
واپس آجا۔(۱۳)

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں سے ادب تخلیق ہوا تھا، خواہ اس کی ساخت دکھ، خوشی اور دیوتا کی خوشنودی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ بہار کے موسم میں ڈرامے بھی کیے جاتے تھے۔ ان کا محور دیوتا ہوتے تھے، یعنی دیوتاؤں کی شادی، دریائے نیل کی طغیانی وغیرہ پر قربانی کے ڈارمے ادا کیے جاتے تھے۔ جن میں دیوتا ہورس، دیوی ایزس اور دیوتا ازیرس، ستات دیوتا اہم کردار ہوتے تھے اور ساری اساطیری داستان کو ڈرامے کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن اختتام میں دیوتا ہورس اپنے باپ دیوتا ازیرس کا بدلہ لیتے ہوئے ستات کو قتل کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر تہوار میں دیوتا کی شادی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

دیوتا آمن نے دیوتا توت سے دریافت کیا کہ دیوی ہموسی کون ہے اس پر دیوتا توت نے اس کو بتایا کہ یہ بڑی حسین اور خوب صورت عورت ہے۔ اس کی خوب صورتی، حسن و جمال اور جوانی کی کوئی نظیر نہیں ملتی یہ سن کو دیوتا آمن سج دھج کر اہموسی محل جاتے ہیں وہ اس وقت گہری نیند میں ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی دیوتا آمن اس پر فدا ہو جاتے ہیں اور ادھر اہموسی دیوتا آمن کی خوشبو سے جاگ جاتی ہیں وہ بھی دیوتا آمن کو اپنا دل دے بیٹھتی ہے۔ لہذا دونوں وہیں پر رات گزارتے ہیں جس سے اہموسی حاملہ ہو جاتی ہے انھیں ایک بیٹی کی اولاد ہوتی ہے جس کا نام دیوی ہشت شی پشت رکھتے ہیں۔ یہی پھر مصر کی ملکہ بھی بنتی ہیں۔

مصری لوگ اس داستان کی وجہ سے دیوتا آمن کی شادی کا جشن مناتے ہیں اور یہ جشن اس دن منایا جاتا ہے جس دن ملکہ ہشت شی پشت مصر کی ملکہ بنی تھیں۔ لہذا اس تہوار کے دن ایک بہت بڑا جلوس نکالا جاتا تھا۔ جلوس کرتک کے مرکز سے شروع ہوتا تھا اور کشتی میں سوار ہو کر دریائے نیل سے ہوتے ہوئے مصر کے مندر میں جاتا اور پھر اسی راستے سے واپس آتا تھا۔ جلوس میں منہت چار بڑے صندوق اپنے کاندھے پر اٹھائے چلتے تھے اور ان کے ہمراہ چار آدمی شیر کی کھال پہنے چلتے تھے اور سب سے آگے بڑا منہت دربان بھرا برتن لیے چلتا تھا اور فرعون دیوتا آمن کی سوار کشتی کے پیچھے چلتا تھا اور اس کے پیچھے افراد پر مشتمل بہت بڑا جلوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس جلوس کے ہمراہ مسلح سپاہی ہوتے تھے۔ سب لوگ دیوتا آمن اور فراعنہ کی تعریف میں نغمے، گانے بجاتے چلتے تھے۔ جلوس انصر کے مندر پر پہنچتا تو صندوق اٹھا کر منہت مندر میں چلے جاتے تھے یہاں قربانیاں کی جاتی تھیں۔ عورتیں رقص کرتی تھیں اور بعد ازاں صندوق جلوس کے ساتھ واپس کرتک کے مندر پہنچائے

جاتے تھے یہاں پر بھی قربانی کی جاتی تھی۔ مصری اس کو سب سے مقدس تہوار سمجھتے تھے اور یہ تہوار نو دن تک چلتا تھا۔

اس کے علاوہ دیگر بھی تہوار منائے جاتے تھے جن میں فرعون کی تاجپوشی کی سال گرہ، مصر زیریں اور مصر بالا کے اتحاد کا دن مندر پر غلاف چڑھانے کا تہوار اور فرعون کی سواری نکلنے کا تہوار بڑی عقیدت سے منائے جاتے تھے جبکہ رقص موسیقی گانا بجانا، شراب نوشی، مرد و عورت دونوں کرتے تھے۔ یہ ان کی زندہ دلی کی علامت تھی۔

قدیم مصر میں انسان کی قربانی کا تصور ملتا ہے۔ دریائے نیل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انسان کو قربان کیا جاتا ہے اور ایسی قربانی کا تصور انتہائی قدیم ہے۔ مصر کی تاریخ کو نیا موڑ مسلمانوں کی آمد کے بعد ملا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کو فتح کیا گیا اور بعد میں فاطمین نے یہاں ادارے بنائے جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ قدیم مصر میں دو چیزیں اہمیت کی حامل ہیں ایک حنوط دوم اہرام اور یہ دونوں عجوبہ روزگار کا درجہ رکھتے ہیں۔

حنوط دراصل مردہ جسم کو محفوظ کرنے کا طریقہ تھا۔ جو تین طرح کے ہوتے تھے۔ فرعون اور امراء کے لیے اعلیٰ درجے کا حنوط کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ درجے کے حنوط کے لیے لاش کے سر سے اس کا بھیجا نکالتے تھے اور لاش کو چیر کر اس کی آلائیشیں باہر نکالتے تھے۔ عمدہ شراب یعنی کھجوری شراب سے جسم کو صاف کیا جاتا تھا اور دیگر دوائیں بھر دیتے تھے بعد ازاں ۸۰ دن تک جسم کو کھاری نمک میں رکھا جاتا تھا۔ پھر اس کو باہر نکالا جاتا تھا اور دھو کر گوند بھرے کپڑے کی پٹیاں جسم پر لپیٹ دی جاتی تھیں۔ بدن کی آلائیشوں کے ساتھ مقبرے میں رکھ دی جاتی تھیں اور اسی طرح بادشاہ اور امراء کی لاشیں حنوط کی جاتی تھیں۔ دوسرا سستا طریقہ تھا۔ اس میں ازرہ کا گوند پیٹ میں داخل کر دیتے تھے اور پیٹ کو پھاڑ کر آلائیشیں باہر نکال دیتے تھے اور پھر لاش کو ستر دن تک نمک میں رکھتے تھے جس کی وجہ سے جسم کا سارا گوشت جھڑ جاتا تھا اور جسم پر چمڑے اور ہڈی کے سوا کچھ نہیں بچتا تھا اور بندش وغیرہ کے بعد لاش وارث کے حوالے کر دیتے تھے۔ تیسرا طریقہ غربا کے لیے تھا لہذا جسم کو حنوط کرنے کا طریقہ مصری تہذیب کا حصہ ہے۔

اہرام بھی اسی تسلسل کا حصہ ہیں، فرعون بادشاہ بننے کے بعد اپنے لیے مخروطی مقبرہ تیار کرواتا تھا جس کو اہرام کہتے ہیں۔ عرب نے جب مصر کو فتح کیا تو انہیں مخروطی مقبرے کا نام سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو کیا کہا جائے۔ لہذا انھوں نے "ہرم" کہنا شروع کیا۔ جس کے معنی پرانی چیز کے ہیں۔ فراعنہ عہد میں اس کا رواج

شروع ہوا۔ سب سے پہلے "را" دیوتا کی عقیدت میں ہرم بنائی گئی بعد ازاں ہر فرعون نے اپنے لیے خود مقبرہ بنوایا۔ یہ مخروطی شکل میں ہوتا ہے اور پتھروں سے بنایا جاتا ہے۔ یہ وسیع و عریض ہوتا ہے اور اس میں داخل ہونے کے راستے غلط بنائے جاتے ہیں تاکہ کوئی چور اس میں داخل نہ ہو سکے یا پھر راستے میں گھومتا رہے نقشہ کے بغیر درست منزل تک پہنچنا ناممکن ہوتا تھا۔ لہذا اہرام مصر عجائبات کا درجہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر بت بھی ملتے ہیں جس میں سب سے مشہور و معروف ابوالہول کا مجسمہ ہے۔

قدیم مصر مذہب کے علاوہ دیگر معاملات میں کافی آگے تھا۔ یہاں سائنسی ایجادات میں تیزاب اور نمک کا استعمال بھی ملتا ہے اور اہرام کو بنانے والے ماہر بھی تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن تعمیر میں انھیں دسترس حاصل تھی، مصر دریائے نیل اور صحرا کی وجہ سے بھی اپنی الگ اور جدا حیثیت رکھتا ہے بلکہ قدیم تہذیب و تمدن میں نمائندہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ مصر کی تاریخ سے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بھی قلمبند ہے۔ جو ہماری اسلامی تاریخ کا حصہ بھی ہیں۔ مصریوں اور بنی اسرائیل کی عناد بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مصر کو ترقی عرب فاتح نے بخشی ہے۔ جنھوں نے اس کو فتح کرنے کے بعد اسلام کا پرچم بلند رکھا اور سارے غیر اسلامی عقائد کا خاتمہ کیا۔

فاطمی فاتح نے یہاں شہر آباد کیے اور مساجد بھی تعمیر کروائی ہیں۔ جن کو دنیا بھر میں عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جن میں سے مسجد عمرین العاص، جامع عسکر، جامع احمد ابن طولون، جامعہ ازہر اور قبہ امام شافعی اہمیت کے حامل ہیں۔ امام شافعی یہاں مدفون ہیں اور عوام و خواص کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اس کا قیام صلاح الدین ایوبی کے عہد میں ہوا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ خطہ اسلامی تعلیمات کا مرکز بن گیا اور یہاں کے عجائبات کو محفوظ کیا گیا جو ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

(د) ادب اور تاریخ و تہذیب کا باہمی ربط:

انسان نے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کد و کاش اور جد و جہد کا راستہ اختیار کیا، اسی کاوش نے اس میں تجربہ اور تجسس کو بھی تقویت بخشی ہے۔ تجسس اور تجربے کو بیان کرنے کے لیے زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ زبان کی تخلیق اجتماعی عمل ہے۔ یہ کسی فرد واحد کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سماج یا معاشرے کی اجتماعی کوششوں کا ثمر ہے اور اس کے ثمرات بھی اجتماعی نوعیت کے ہیں جب انسان نے زبان کو تخلیق کیا تب اس نے گفتگو اور بات چیت بھی شروع کی۔ کاروباری بات چیت کے علاوہ اس نے اپنے تجربات و

مشاہدات کو بھی بیان کرنا شروع کر دیا جہاں سے اساطیری داستان، لوک قصوں نے بھی جنم لیا، ابتدا میں یہ قصے ذاتی نوعیت کے بنائے جاتے تھے۔

جوں جوں انسان کا ذہن ترقی یافتہ صورت اختیار کرتا گیا ویسے ویسے قصوں اور داستانوں میں حس و جمالیات بھی در آئی اور انسان کے اسی حس و جمالیات نے فنون لطیفہ کو تخلیق کرنا شروع کیا۔ چوں کہ انسان کا ذہن تغیر آمادہ رہا ہے نئے نئے تجربات سیکھنے کا متلاشی رہا ہے چنانچہ اس تلاش نے کئی فن پارے اور قصوں کو بھی تراشنا شروع کیا۔ اب انسان ذہنی صلاحیتوں اور زبان کی خوبیوں سے روشناس ہونے لگا۔ ہاتھوں کی مدد سے سنگ تراشی اور بت تخلیق کرنے لگا، زبان کی توسط سے اپنے جذبات، خیالات اور تصورات کو پیش کرنے لگا۔ تاریخ کا یہ وہ لمحہ تھا جہاں غیر ارادی طور پر ابدیت کو فروغ دے رہا تھا۔ چنانچہ وہ فکر کے ساتھ فن بھی دریافت کر رہا تھا۔

> ہر زمانے کا فن اس زندگی کی بدولت زندہ رہا ہے جس کے نقش اس نے پیش کیے ہیں، فن ہمیشہ ایک مخصوص معاشرے کے بطن سے پیدا ہوا اور فن کا سرچشمہ ارضی اور مادی زندگی ہے۔ (۲۳)

بہر حال قدیم عہد کے قدیم انسان نے وہی کچھ بیان کیا جو اس کی صلاحیتوں کا متقاضی تھا۔ جوں جوں اس نے مادی ترقی کی ویسے ویسے اس کے اظہار و بیان میں تغیر آتا رہا، چونکہ انسان ایک ہمہ جہت پہلو رکھتا ہے ایک جانب سے ذہنی اور دماغی ارتقا کے مراحل بھی طے کرنے میں پیش پیش رہا، نیز انسان سوچنے والا وجود ہے۔ وہ اپنے لیے سوچتا ہے، اپنے ارد گرد کے ماحول کے لیے سوچتا ہے اور سوچنے والا ذہن ادب بھی فہم و دانش سے تخلیق کرتا ہے۔ باوجود اس کے وہ ارضی اور مادی بندشوں میں قید ہے لیکن اس کا تخیل آزاد پرندے کی طرح کھلی فضا میں پرواز کرنے کی کدوکاوش میں مصروف رہتا ہے۔ اسی خوبی نے اس کو ادب، فنون لطیفہ معاشرت اور تہذیب کی بنیادیں رکھنے پر اکسایا ہے۔ انسان اپنے ایک خاص وجود کی بنا پر دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم انسان نے اپنی تخلیقی طبع کی وجہ سے فنونِ لطیفہ کو جنم دیا۔ فنون لطیفہ میں موسیقی، رقص، سنگ تراشی اور مصوری بھی شامل ہے اور یہ تمام تخلیقات انسان کی حس و جمالیات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان فطرتاً جمالیات سے لگاؤ رکھتا ہے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے اقدامات بھی کرتا ہے اور یہی حسن وہ مادی زندگی میں تلاش کرتا ہے اور یہ تلاش مادی ترقی اور مادی مسرت کی طرف لے آئی۔

چنانچہ معاشی آسودگی کے لیے انسان نے جنگیں بھی لڑی ہیں۔ عمومی طور پر یہ تصور ہے کہ انسان نے جنگی گیت گائے تھے، فتح و شکست کے گیت گائے جاتے تھے۔ ان گیتوں میں عظمت اور جاہ و جلال اور بہادری کے تذکرے پیش کیے جاتے تھے۔ یہیں سے ادب کے ابتدائی نقوش پروان چڑھنے لگا، پھر عبادات اور بتوں کی پوجا، دیوتاؤں کی خوشنودی کے گیت گائے جانے لگے۔ خوشی و طرب کے سامیں موسیقی، ناچ اور رقص کو دخل ہوا اور جب انسان نے لکھنے کا فن تخلیق کیا تب یہ تمام چیزیں لکھی جانے لگیں۔ ادب کا ابتدائی فکر خوشی، تفریح اور حسِ جمالیات پر مشتمل تھا۔ جوں جوں انسان نے ذہنی، ثقافتی اور فکری منازل طے کیے ویسے ویسے ادب میں بھی تغیر آتا گیا اور ادب انسانی حیات کا جزو لاینفک بن گیا۔

دنیا کے تمام عمرانیات اور بشریات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ادب میں شاعری پہلے تخلیق ہوئی اور نثر بعد میں تخلیق کیا گیا۔ چونکہ شاعری کا براہ راست تعلق جذبات کی ترجمانی سے ہے اس لیے شاعری پہلے معرض وجود میں آئی۔ لہذا شاعری محض حالات کی ترجمانی تک محدود نہیں بلکہ مستقبل کی تشکیل اور انسانی زندگی کی ترتیب، تہذیب و ترقی میں بھی موثر اور کارآمد قوت کے طور پر ابھری، یقیناً روشنی کی وہ پہلی کرن ہے جس نے جہالت کی ظلمت کو دور کرنے میں موثر کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں مجنوں یوں رقم طراز ہیں کہ :

> فنون لطیفہ کی سب سے زیادہ تربیت اور سب سے زیادہ لطیف صورت ادب یعنی الفاظ کا فن ہے جو سنگ تراشی اور مصوری کے بعد وجود میں آیا اور ادب کی تلاش سب سے زیادہ قدیم سب سے زیادہ بے ساختہ اور سب سے مقبولِ عام شکل شاعری کی ہے۔ (۲۴)

شاعری میں شائستگی، بے ساختگی اور فکری رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ بلکہ شاعر کو ایک زمانے تک فلسفی تصور کیا جاتا تھا کیونکہ شاعری فکر اور تفکر کا نتیجہ تھی، تاثر اور تفکر اور خارجی دنیا کے ساتھ مقابلے اور کائنات کے مطالعے کا اظہار ہے۔ شاعری فکر و تفکر کے ساتھ جہد البقا کی علامت بھی رہی ہے۔ نیز ادب اور ادب لطیف انسانی کاوش اور جودتِ طبع کی عمدہ مثال ہے۔ جس میں فکر و فہم، دانش، تجربات، احساسات اور زبان و بیان کے جوہر نمودار ہوتے ہیں بلکہ الفاظ ہی انسان کا اصل جوہر ہیں اصوات نے تجربات کی ترجمانی کرنی ہے۔ بامعنی الفاظ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور یہ صرف ادب کی خوبی ہے جبکہ موسیقی کا اصلاً اصوات کا فن ہے نیز اس کی ساری عمارت سروں پر محیط ہے اور مصوری قلم کی مرہون منت ہے جو جذبات و واقعات کو آب و رنگ کی مدد سے پیش کرتی ہے۔

دیگر فنون بھی الفاظ واصوات سے بے نیاز ہیں جبکہ انسانی تہذیب اور تاریخ کو الفاظ نے عمدہ پیراہن عطا کیا ہے۔اس تناظر سے ادب آرٹ بھی ہے اور زبان وبیان کی ترقی بھی ہے۔اس لیے بعض مفکرین نے ادب کو انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا زبان اور الفاظ کے ذریعے اظہار و تسلیم کیا ہے۔یعنی زبان اور الفاظ کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ تحریر ہی ادب کا سرچشمہ ہے۔ اگر انسان فنِ تحریر ایجاد نہ کرتے تو ادب بھی تخلیق نہ ہو پاتا، فن تحریر نے انسانی جذبات، احساسات، تصورات اور خیالات کو ابدیت کا درجہ عطا کیا ہے۔اس لیے ادب کے لیے تحریر ناگزیر عمل ہے اور تحریر میں تخیل کو بھی دخل حاصل ہے۔ تخیل ہی نے واقعات اور جذبات کو دوام بخشا ہے۔ادب کی جامع تعریف سید عبداللہ یوں کرتے ہیں کہ :

> ادب وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خاص نفسیاتی و شخصیاتی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی و تنقید بھی کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوت مخترعہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے ایسے مسرت بخش حسین اور موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع و قاری کا جذبہ و تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا۔[۲۵]

اس تعریف میں تین پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے،اول ادیب کی اپنا نفسیاتی و شخصیاتی خوبیاں جن کو وہ جذبات کے ذریعے رقم کرتا ہے۔ دوم اس کا اپنا تخیل کی اڑان اور اپج جس کے توسط سے وہ واقعہ کو دل آمیز پیرائے میں بیان کرتا ہے اور سب سے اہم پہلو کہ جس طرح مصنف نے خود محسوس کیا جو اس کی جنفئت ہوئی، اسی کو وہ اسی طرح منتقل کرلے کہ قاری بھی اس کیفیت سے دوچار ہو، قاری کا بھی تخیل اور جذبہ ویسے ہی متاثر ہو، یہ وہ اہم پہلو ہے جس کو سید عبداللہ نے بیان کیا ہے۔انسان اپنے تجربات اور تصورات اس لیے بیان کرتا ہے کہ دوسرا اس سے استفادہ کرے، سیکھے اور اکتساب کرے۔ اگر اس پہلو کو فراموش کر دیا تو جائے ادب کا افادی پہلو فوت ہو جائے گا جو تحریر کی اصل قوت ہے۔

انگریزی زبان میں ادب کے لیے لٹریچر لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو لاطینی زبان سے مشتق ہے۔ جبکہ ادب عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی وہ نہیں ہے جن معنوں میں اردو میں استعمال کیا جاتا ہے۔اردو زبان میں اس کے لیے کوئی دوسری موزوں اصطلاح بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ادب انسانی فکر و فہم، دانش، تجربات، مشاہدات، داخلی و خارجی کیفیات کو قلمبند کرنے کو کہتے ہیں۔انسان نے ذاتی تجربات کے ساتھ اجتماعی روداد بھی

قلمبند کیے ہیں اور کسی بھی قوم یا خطے کے لوگوں کا رہن سہن، چال چلن، طور اطوار، مادی حالات و آلات، طرزِ زندگی، طرزِ معاشرت، نظام حکومت، عقائد اور ایقان کو ضبط تحریر میں لانا، تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ یعنی انسان نے سفر و سیاحت کے دوران منظر دیکھے ہیں جن لوگوں سے ملا ہے ان کو بھی اپنے لوگوں کے لیے لکھا وہ تاریخ اور تہذیب کے زمرے میں آتی ہے۔ ویسے بھی ادب تاریخ اور تہذیب تینوں اجزا ایک ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔

بہر کیف تاریخ اپنے جوہر میں محض واقعات کی روداد نہیں ہے بلکہ کسی بھی خطے کے نظام معاشرت، رہن سہن، اندازِ تفکر، معاشی حالات و واقعات کی ارتقاء کی کہانی ہے۔ اس میں انسانی شعور کو بھی دخل ہے اور مادی عوامل کو بھی دخل ہے اور جہاں تک بات تہذیب کی ہے تو تہذیب کے جامع اور مختلف مباحث کا پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ لہذا تہذیب وحشی حیات سے مہذب رہنے کا عمل ہے۔ شہر آباد کرنا، صنعت و حرفت کو منظم و مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا شامل ہے۔ جبکہ ادب انسان کی مادی اور غیر مادی تجربات، احساسات اور فکر فہم کا احاطہ کرتی ہے۔ ان تینوں کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور تینوں ایک دوسرے کی ترقی اور تشکیل کے لیے کوشاں بھی رہتے ہیں۔

ہم جب کسی قوم کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تب ان کی تہذیب و تاریخ سے بھی آگہی حاصل کرتے ہیں اور تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں زبان و ادب، تخیل، نفسیات، عقائد اور عقیدہ بھی زیرِ مطالعہ آجاتے ہیں۔ اسی طرح تہذیب کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جس کی تہذیب جتنی گہری و گہرائی رکھتی ہو گی وہاں ادب بھی اتنا ہی عمدہ بلند اور رسا ہوا ہو گا۔ بس تہذیب مخصوص زمان و مکان کی کہانی ہوتی ہے جبکہ ادب میں زندگی کی طرح تنوع ہے۔ رنگا رنگی ہے، تغیر ہے جو زندگی کی طرح یہ نو کروٹ بدلتا رہتا ہے۔ تہذیب فکری رجحانات کو جنم دیتا ہے اور ادب ان فکری رجحانات اور تحریک کی نمائندگی کرتا ہے ان کی پیکر کشی اور تصویر سازی کرتا ہے اور تاریخ ان کو اپنے سینے میں سمو لیتی ہے۔ تاہم انسانی زندگی اور معاشرہ اس مثلث پر ترقی کرتا ہے۔

انسان محض زندہ نہیں رہنا چاہتا بلکہ بہتر زندگی جینا چاہتا ہے۔ انسان کی ساری جدوجہد اس کے گرد گردش کر رہی ہے خود انسان ایک نفسیاتی صداقت ہے۔ یعنی ہر انسان ایک نفس، انا، اور ایک ادراک رکھنے والی اکائی ہے۔ ادراک، فہم و دانش آگہی اور حیات ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور حیات ادراک پر دارومدار رکھتی ہے۔ نیز انسان ایک ادراکی یا ادراک رکھنے والا وجود ہے۔ سوچنے کا ایک عمل ہی زندگی کے طور

واطوار میں تنوع پیدا کرتا ہے۔اس میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ عمل اور سوچ کا بھی آپس میں اٹوٹ تعلق اور رشتہ ہے۔اس طرح انسانی حیات دو چیز یا اجزا پر انحصار کرتی ہے۔ایک وجود دوسری سوچ، فہم وادراک ہے۔یہی ادراک تہذیب کے لیے ایندھن ثابت ہوا۔تہذیب اگر وجود ہے تو ادب اس کی سوچ ہے۔اس کا تخیل ہے اور تاریخ اس کی کارستانی اور روداد ہے۔

مختصراً ادب، تاریخ اور تہذیب الگ تھلگ وجود اور حیثیت رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ اشتراق واختلاط اس قدر ہے کہ تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ ادب کی ہر تخلیق میں تہذیب کو گوناگوں مسائل اور اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور تاریخ اپنے تئیں فلسفہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ کسی بھی قوم یا خطے کی معلومات کے لیے کسی ایک کا مطالعہ باقی دونوں کا بھی احاطہ واعادہ کرے گی۔کیونکہ وجود جدا جدا ہونے کے باجود بطن اور روح کی اساس ایک ہی ہے۔لہذا تہذیب روح کا درجہ رکھتی ہے ادب باطن ہے اور تاریخ اس کی ظاہری شکل وصورت ہے۔

(ہ) اردو سفر نامے میں تاریخ وتہذیب سرسری مطالعہ:

انسان فطری طور پر تجسس رکھتا ہے۔وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مناظرِ فطرت سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔اس کی سرشت میں یہ شے شامل ہے کہ وہ فطرت کے قوانین، اصولوں اور واردات سے اکتساب کرتا رہتا ہے اور جہاں اس کو سازگار موحول ملتا ہے وہاں ہجرت کر لیتا ہے یکستانیت سے اکتاہٹ محسوس کرنا اور مقام تبدیل کرنا اس کی فطرتِ ثانیہ ہے تاریخ میں ایک عرصے تک مختلف اقوام اور گروہ سفر اور ہجرت کرتے رہے ہیں۔خود انبیائے کرام کو ہجرت کا حکم ہوتا رہا۔لہذا انسان نے بالآخر ہجرت کرنا چھوڑ دیا یا پھر اس بڑے پیمانے پر نہیں ہوئی جس پیمانے پر ہر عہد گذشتہ یا ماضی قریب میں ہوتا ہے۔لیکن انسان کی معلومات حاصل کرنے والی جستجو میں کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔

اب لوگ سیاحت اور سفر کرتے ہیں۔ایک زمانے تک حج بھی پیدل کیا جاتا تھا۔اس سفر کے دوران مختلف مقامات پر قیام ہونا وہاں کے لوگوں سے ملنا جلنا۔ان کی زبان سے واقفیت رکھنا، سفر کے مصائب کو جھیلنا، یعنی تمام اذیتوں اور مسرتوں کو واپسی میں آکر لوگوں کے ساتھ بانٹنا عام بات تھی۔اس کے علاوہ طلبا تحصیل علم کے لیے بھی سفر کیا کرتے تھے اور سفر کا تصور اور تاریخ انسانی معاشرے میں قدیم اور اولی بنیادیں رکھتا ہے۔ لیکن جوں جوں انسانی معاشرے نے ترقی کی ذرائع اور وسائل میں تغیر آیا لوگ نقل مکانی اور آمد ورفت کے

لیے گھوڑے، اونٹ کے بجائے دیگر ذرائع استعمال کرنے لگے جن میں سب سے اہم ذریعہ سمندری راستہ تھا۔ اس نے سفر کی نوعیت بدل دی شاید مسافت اور مقامات کی نشاندہی کے لیے نقشے بھی ترتیب دیئے گئے۔

نقشوں کی مدد سے سفر اور مسافت طے کرنے کے نقوش انتہائی قدیم ہیں۔ ہر چند کہ اس زمانے میں سفر کا تصور وہ نہیں تھا جو اب ہے۔ اب سیر و تفریح، سیاحت، ماحول اور آب وہوا بدلنے کی وجہ سے بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں حصول علم، معاشی مقاصد اور فطرت کو دریافت کرنے کے علاوہ جنگی اسباب تھے۔ تاریخ میں کولمبس، ابن بطوطہ، البیرونی وغیرہ ملتے ہیں جنھوں نے دنیا کے مشاہدات کے لیے سفر کیا اور ان مقامات، شہروں کے حوالے سے لکھا بھی ہے۔ جبکہ انسانی تاریخ کا پہلا سفر نامہ نگار مغربی مورخین نے ہیروڈوس کو قرار دیا ہے۔ نیز تاریخ نویسی اور سفر لکھنے کی روایت کا آغاز ایک ساتھ ہوا لیکن انقلابات زمانے نے کئی کتابیں اور لائبریریاں اجاڑ دی ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے ہیروڈوس پہلے معلوم سفر نگار ہیں۔ لہذا اسی نام پر اکتفا کیا جاتا ہے جبکہ قرآن مجید میں "سیر وفی الارض" کے ذریعے انسان کے عزم سفر کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے سفر اولین سے آنحضرت صلہ کی ہجرت کو فضیلت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر انبیاء کرام نے بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور مقصدِ تبلیغ کے لیے سفر اور ہجرت کی ہے جن میں حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں۔ الغرض سفر اور ہجرت انسانی تاریخ میں ترقی اور خوشحالی کی علامت ہے اور رب باری تعالیٰ کو بھی پسند ہے۔

سفر کو اسباب اور محرکات کی وجہ سے مختلف اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں۔ مثلاً مذہبی سفر، جس میں حج کی ادائیگی کے علاوہ دیگر مقدس مقامات کی زیارت، اجتماعات میں شرکت بھی ہے۔ کاروباری یا تجارتی سفر انسان کی ذات کے ساتھ پراون چڑھتا رہا ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر، ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر صرف تجارت کی وجہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ اسلام سے قبل عربوں کا برصغیر سے کاروباری اور تجارتی رابطے تھے اور کشتیوں کی مدد سے تجارت کی جاتی تھی۔ جنگی سفر یہ سفر دشمنوں سے مقابلے کے لیے کیا جاتا تھا۔ لیکن ان سب سے منفرد اور الگ تھلگ حیثیت مہماتی سفر کو حاصل ہے۔ اس سفر کی وجہ سے مہم جوئی کرنا ہے۔ قدیم عہد میں کولمبس ابن بطوطہ واسکوڈے گاما جیسے ان گنت لوگوں نے اپنی زندگی کو خطرات میں ڈال کر مسافت طے کی اور تجربات ومشاہدات کیے۔

اب بھی ایڈونچر کے دلدادہ اور مشتاق اپنی جان جوکھم میں ڈال کر رختِ سفر باندھتے ہیں۔ لہذا سفر کی ایک قسم سیاحت بھی ہے۔ جس کا مقصد صرف فطرت کے مظاہر اور مناظر کا مطالعہ کرنا ہے اور اسی مطالعے اور

مناظر کو لکھنا سفر نامہ کہلاتا ہے۔ سفر نامے کی کوئی تکنیک یا کوئی خاص اصول متعین نہیں ہیں لیکن اس کا انداز بیانیہ ہے۔ ہر چند اگر سیاح یہ سوچ کر سفر کرتا ہے کہ مقامات اور مناظر، تہذیب و تمدن کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ضبطِ تحریر میں بھی لانا ہے۔ تو وہ اپنی طبع انفرادی خصوصیات کے مطابق تکنیک اور اسلوب بھی وضع کر لیتا ہے۔ اس کی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ باصرہ جس قدر تند اور تیز ہو گی وہ اسی قدر زیادہ سے زیادہ عمیق، گہرائی و گیرائی کے ساتھ چیزوں کا اندازہ اور تزکیہ کرنے کی قوت رکھتا ہے اور یہ بھی سفر نگار کی پسند اور مزاج پر انحصار کرتا ہے کہ وہ سفر میں پیش آنے والے واقعات، مقامات میں سے کن پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے اور کس کو فراموش کر دیتا ہے۔ اچھا سفر نگار وہی ہوتا ہے جو قاری کو اپنے ہمراہ سفر کرواتا ہے۔ اس کی تحریر میں محاکات کا پہلو اساسی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ قاری اس مقام، ملک یا شہر نہیں گیا ہے جہاں سفر نامہ نگار گیا ہے۔ وہ تو اس سفر نامے کو پڑھ رہا ہے اس لیے قاری کی آنکھوں کے سامنے ان مقامات، مناظر اور سفر کے مصائب و مسائل یوں عیاں ہوں کہ وہ محسوس کرے کہ وہ خود سفر کر رہا ہے اور مقامات کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے جبکہ ناقدین کی تکنیک پر مختلف آرا ہیں اس حوالے سے مرزا ادیب لکھتے ہیں کہ:

> سفر نامہ نگار تو جو کچھ دیکھتا ہے جو کچھ پاتا ہے جس جس مقام سے گزرتا ہے اس کی ساری خوشبوئیں، اس کے سارے باطنی رنگ اور اس کی ساری کیفیات جو پردہ راز میں چھپی ہوئی ہیں ان سب کو سمیٹ لیتا ہے۔ وسائل اور ذرائع پر تکیہ کر کے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔ سفر نامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجزیہ ہے اس کا اطلاق انہی معنوں میں ہوتا ہے جو تخلیقی تجربے سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ (۲۶)

مرزا ادیب نے تخلیقی پہلو پر زور دیا ہے۔ ان کی نظر میں سفر نامے کی ادبی اور تخلیقی حیثیت مقدم ہے۔ جبکہ سفر نامہ نگار لازم نہیں کہ ادبی، فنی خصوصیات سے واقف ہو یا دسترس رکھتا ہو۔ تاہم سفر نامے کی خوبی اسلوب، فن اور تکنیک کے بجائے اس کی تاریخ اور جغرافیائی حدود کو بیان کرنے میں پوشیدہ ہے۔ قدیم سفر ناموں میں ادبی لطافت سے کہیں زیادہ وہاں کے لوگوں کے مزاج، عقائد، رہن سہن، صنعت و حرفت کو بیان کیا جاتا تھا۔ وہاں پائے جانے والے نباتات، حیونات کی خصوصیات کو پیش کیا جاتا تھا جس سے قاری کے مشاہدے میں اضافہ ہوتا ہے اور اب ادبی ذوق، اسلوب بیان کو اولیت دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے علمی، معلوماتی، جغرافیائی نظام سیاست، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن کو بیان کرنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ

جدید سفر نامہ قاری کے بجائے اپنی ذات اور ذاتی اوصاف کے متعلق لکھا جانے لگا ہے۔ چنانچہ بقول سید عبداللہ کہ:

> ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت و جامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحہ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شے نظر میں سما جانے والی ہو، تماشہ، نغمہ و نگہت کا ہر صورت و رنگ لفظوں کی امیجری میں جمع ہو کر بیان کو مرقع بہار بنادے اور قاری ان تمثالوں میں جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنائے۔[۲۷]

موصوف نے بھی سفر نامے کو حرکت پذیر، اور مشاہد کا مرکز قرار دیا ہے اور سفر نامہ نگار پر یہ ذمہ داری عائد کر دی ہے کہ وہ اپنے تمام حواس خمسہ کے ذریعے تجربات و مشاہدات کا عمیق تجزیہ بھی اخذ کرے اور قاری کو دورانِ سفر ساتھ ساتھ لے کر چلے تاکہ وہ بھی نگاہوں سے مشاہدہ کرنے میں کامیاب ہو۔

لہذا اگر البیرونی، ہیر وڈورس، ابن بطوطہ کے سفر ناموں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں تخلیقی و ادبی ذوق کے بجائے تاریخ، تہذیب، تمدن، عقائد، خطے کے موسموں کا حال، لوگوں کے رہن سہن، طبعی و رواحانی ذوق کا علم ملتا ہے۔ در حقیقت ان کے سفر نامے تاریخ و تہذیب کی عکاسی ہیں۔ انھوں نے وہاں کے نظامِ سیاست، طرزِ حیات کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ اپنے تجزیے بھی پیش کیے ہیں۔ جو ایک علمی مباحث کا درجہ رکھتے ہیں۔

ابن بطوطہ کا سفر نامہ بیان کے اعتبار سے انفرادیت رکھتا ہے۔ ان کا سفر نامہ پڑھنے سے بہت سی تاریخی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم انھوں نے ہندوستان کے متعلق صرف سفر نامہ ہی نہیں لکھا بلکہ تاریخ بیان کی ہے۔ اس دور کی طرز حکومت کو پیش کیا ہے۔ رعایا اور بادشاہ کے درمیان تعلق اور بیگانگی کو لکھا ہے کہ ان کے درمیان کس قسم کا تعلق تھا اور طرزِ حکومت کی کونسی خوبیاں یا خامیاں تھیں۔ اس کے ساتھ اس عہد کے مقامات و آثارِ قدیمہ کے بارے میں بھی بہت سی معلومات فراہم کیں ہیں اور یہاں کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تجارت، صنعت و حرفت کا بھی مفصل حال بیان کیا ہے۔

اردو زبان میں ابھی تک پہلا سفر نامہ یوسف کمبل پوش کا عجائبات فرنگ ملتا ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء میں دہلی میں شائع ہوا اس کے بعد ۱۸۹۸ء میں نول کشور پریس لکھنو نے شائع کیا۔ یوسف کمبل پوش نے یورپ کے گوناگوں صفات کو دل کش انداز میں رقم کیا ہے اور جگہ جگہ پر یورپ کی دلکشی، دولت و ثروت، امارات و عمارتوں کا ذکر پر شکوہ انداز میں کیا ہے اور ان کی تحریر سے افسوس، شکوہ کا انداز جھلکتا ہے کہ یورپ میں جو

چیزیں ہیں وہ ہندوستان میں نہیں ہیں اور جگہ جگہ یورپ کا موازنہ اور مقابلہ اپنے ملک سے کیا ہے۔ وہ اس امر کو فراموش کر کے گئے مانگلستان ایک حاکم ملک ہے اور ہندوستان محکوم خطہ ہے۔ جس کی ترقی اور ارتقاء کو انگلستان نے کر کے رکھا ہے اس کے علاوہ انگلستان کی ظاہری رنگینیوں پر رشک کرنا، حیرانی ظاہر کرنا خود باعثِ حیرت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> عجب شہر ہے لڑکوں کنواروں خوب صورتوں کو دیکھا کہ استاد کے سامنے بڑے امتیاز سے بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ فرد و بزرگ سے حسب مراتب آداب سے پیش آتے ہیں۔ حیران ہوا کہ ہمارے لڑکے اس سن میں نشست و برخاست کی تمیز نہیں رکھتے یہ کیا شے ہیں جو اس صغر سنی میں باوجود حسن و جمال کے دانائی میں بڈھوں سے سبقت لے گئے ہیں۔ (۲۸)

یوسف کمبل پوش نے انگلستان کے درس وتدریس کا ذکر کیا ہے کہ حسین و جمال اور خوبرو لڑکے اپنے اساتذہ کے سامنے نہایت ادب و احترام سے بیٹھے علم حاصل کر رہے ہیں اور پھر اس کا موازنہ اپنے ملک کے لڑکوں سے کیا کہ ہمارے ملک کے لڑے اس عمر میں درس وتدریس تو دور کی بات ہے ابھی اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے کے آداب سے نابلد ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک جس شے کی کمی نظر آئی اس کا بھی صدقِ دل سے اظہار کیا ہے۔ سفر نامہ نگار میں یہ اخلاقی جرات ہونی چاہیے کہ وہ اپنے لوگوں کی خامی کا اعتراف کریں تاکہ نرگسیت کا شکار ہو حالانکہ یہ موازنہ درست نہیں ہے۔ لیکن یہ ان کا ذوق و شوق تھا کہ انھوں نے یورپ کے ممالک کا سفر کیا اور تاریخ وار واقعات قلمبند کیے ہیں۔ انھوں نے لندن، پیرس کے مقامات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ تھیٹروں، سرکسوں اور قدیم عمارتوں، مسافر خانوں کے حالات، زیبائش، ترتیب اور تعلیم کا ذکر دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔

> راہ میں مسافر خانے بنے ہوئے ہیں تاکہ مسافر کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، مچھلی انڈے، مرغی، شراب، وہاں موجود اور بلو کچھ بچا ہے وہاں سے مفقود۔ (۲۹)

اس بیان سے وہاں کے نظم و نسق کا علم ہوتا ہے کہ وہاں کی حکومت نے اپنے شہریوں کے علاوہ مسافروں کے لیے کس قسم کا ذمہ دارانہ انتظام کیا ہوا ہے۔ سفر نامہ نگار کے اندر یہ خاصیت ہونی چاہیے کہ وہ انتظامی امور پر بھی اپنی رائے دے سکے تاکہ قاری کو دوسرے ملک کے نظام سیاست و ریاست سے بخوبی آگاہی ہو سکے اور ان کے ہاں کی تہذیب و تمدن سے بھی واقفیت ہو سکے اور وہاں کے چال چلن سے بھی آگاہی ہو سکے۔

انھوں نے مصر کا بھی سفر کیا اور محمد علی خدیو کے مصر اور اس کی طرز حکمرانی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو ان کی سیاسی بصیرت، فہم و دانش کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کا ثبوت ہے بلکہ عوامی امنگوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> محمد علی شاہ مصر کا ملک فتح کرنا چاہتا ہے۔ اس کے زن و مرد کو پکڑتا ہے۔ ان کو ورماہے کہ خود سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا ہے ہر سپاہی ان کو اس بازار میں لا کے ان ظالموں کے ہاتھ کم قیمت پر بیچ دیتا ہے۔ (۳۰)

اس عبارت سے مصنف کی انسان دوستی عیاں ہوتی ہے اور انسانوں سے محبت کے جذبات سرشار ہیں۔ انھیں یہ بات قطعی پسند نہیں ہے کہ مرد اور عورتوں کو بازار میں یوں بیدردی سے فروخت کیا جائے کیونکہ اس میں انسان کی تذلیل ہوتی ہے۔ ایک انسان کو انسانوں والی زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے تاکہ حاکم زمین پر قبضہ کرنے کی نسبت سے وہاں کے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح تشدد کرے اور چند پیسوں کے عوض فروخت کر دے۔

یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء کی نثر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے اس سفر نامے کی زبان بھی قدیم ہے بیان انتہائی سادہ اور دلفریب ہے۔ جبکہ کہیں کہیں روایتی تک بندی بھی ملتی ہے اور کہیں کہیں داستانوی انداز کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے مصنف خود بھی سفر سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور قاری کو بھی دلچسپی کا سامان فراہم کر رہا ہے اور ان کا مشاہدہ بھی گہرا ہے۔ دورانِ سفر مماثلت اور موازنہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ نیز یہ سفر نامہ ابتدائی ہونے کے باوجود عمدہ اور اپنی نظیر آپ ہے۔

ان کے سفر نامے کے بعد سر سید احمد خان کا سفر نامہ مسافرانِ لندن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سر سید احمد خان نے لندن کا سفر یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں شروع کیا اور ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء پر ختم کیا، ان کے سفر کا اصل مقصد وہاں کی ترقی و تعمیر کو دیکھنا اور سمجھنا تھا۔ نیز ان کا سفر اپنی ذات میں قومی فلاح و بہبود کا متلاشی تھا جبکہ یوسف کمبل پوش نے صرف اپنی ذاتی ذوق و شوق کی وجہ سے کیا تھا۔ اس حوالے سے سر سید احمد خان کا سفر وسیع تر قومی مفادات کی عکاسی کرتا ہے اور انھوں نے وہاں جانے کے بعد ہی تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا اور خطبات احمدیہ تحریر کیا اور دوسری جانب اپنے نظریات اور خیالات کو گرد آلود نہیں ہونے دیا اور جو محسوس کیا اس کا صدق بیانی سے اظہار بھی کیا۔

چنانچہ ان کا سفر نامہ کسی سیاح کا نہیں بلکہ مصلح قوم کا سفر نامہ ہے وہ وہاں جن چیزوں کو دیکھتا ہے اس کا صدق دل سے اپنے وطن سے موازنہ بھی کرتا ہے اور دکھ وافسوس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اپنے وطن کی تنزلی اور جہالت پر خون کے آنسو بہاتا ہے اور ترقی کے اسباب تلاش کرتا رہتا ہے۔ لہذا یہ سفر نامہ لندن کی علمی، ادبی و ثقافتی ترقی کے محرکات کو بیان کرتا ہے۔ وہاں کے تعلیمی اداروں کی تعمیر و ترقی کو بخود دیکھا۔ وہاں کی تہذیب و تمدن سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ عدن، سویز نہر، مصر کی بھی سیر کی، جہاں انھوں نے مصر کے بازاروں اور ریلوے اسٹیشن اور زراعت کا ذکر کیا ہے وہاں پر اپنے ملک کے لوگوں سے موزانہ بھی کیا ہے اور مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> البتہ بہ نسبت ہندوستان کے مصر والوں کی اس قدر تعریف کرنی چاہیے کہ وہ خود ان سب چیزوں سے کام کرنے اور کام لینے کے لائق ہیں۔ ہندوستانی بدبخت اس لائق بھی نہیں ہوئے۔ (۳۱)

اور جب مصر کے کارخانوں کا ذکر کرتے ہیں تو انھیں انگریزی حکومت سے موازنہ کرتے ہیں اور ان کے میلے کچیلے ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ مصریوں میں صفائی کا فقدان ہے سڑکیں، راستے میلے دیکھتا ہے جس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں لہذا انھوں نے جگہ ہندوستانیوں کا دیگر اقوام سے موازنہ کیا ہے اور ہندوستانیوں کی خامیوں کا صدقِ دل سے اظہار بھی کرتے ہیں ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ:

> مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہے کہ گو ہمارے ہندوستان کے مسلمان بھائی جہل مرکب میں مبتلا ہوں مگر اور ملکوں میں جو ہمارے مسلمان بھائی ہیں انھوں نے تربیت و شائستگی میں ترقی کرنی شروع کی مصر اور ترکی یعنی سلطان روم کی عملداری کے مسلمان روز بروز شائستگی میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ (۳۲)

سر سید احمد خان نے جہاں جس قوم کی خوبیاں دیکھی ہیں ان کو نیک نیتی سے بیان کیا ہے اور ان کے سفر نامے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خیال آفرینی، داستان نویسی کے بجائے حقیقت نگاری جھلکتی ہے۔ تاریخ و تمدن کا عمیق مطالعہ و موازنہ تعلیم و تربیت کے وسائل، اسباب اور محرکات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اتنا وسیع اور گہرا ہے کہ ان کی نگاہ سڑکوں کی گندگی کو بھی دیکھتی ہے۔ ریلوے کے نظام بھی پرکھتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے رہن سہن فکر اور اندازِ گفتگو کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ مصر، عدن، ترکی اور پیرس ولندن کی تہذیب و تمدن، طور وطوار، سیاسی و معاشرتی ترقی کا بھی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ

ادب، فنون لطیفہ، رسائل، کتب خانوں کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس سفر کا اصل محرک ہندوستان کی نظام تعلیم میں تبدیلی لانا تھا اور اس کے لیے ترقی یافتہ ملکوں کی درس گاہ، کتب خانوں کا مشاہدہ لازم تھا۔ لہذا سر سید نے اپنے سفر کے آغاز سے ہی خاص مقاصد متعین کیے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ مذہبی جوش و جذبہ اور ولولہ بھی کارفرما تھا کہ لائف آف محمڈن کا عملی بنیادوں پر جواب دیا جائے، انھوں نے یورپ اور دیگر ملکوں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا اور خطبات احمدیہ لکھی۔

سر سید احمد خان کے سفر نامے میں فکشن کے بجائے صداقت، سادگی، سلاست کے ساتھ رشک و موازنے کا عنصر غالب ہے۔ جگہ جگہ پر ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر افسردہ دکھائی دیتے ہیں اور یورپ کی ترقی پر رشک کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ہندوستان میں جا کر جو انگریز ہم کو مثل جانور جانتے ہیں در حقیقت ہم ہندوستانی ایسے ہی ہیں۔ عقلمند اور عبرت اور نصیحت پکڑنے والا آدمی تمام حالات اور رسم و رواج یورپ دیکھ کر یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ کون کون سی رسمیں اور عادتیں ہندوستان کی اور خصوص مسلمانوں کی اچھی ہیں اور کون سے خراب اور قابل تبدیل ہیں۔ (۳۳)

انھوں نے سماجی رسومات پر بھی نکتہ چینی کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان عجیب و غریب رسومات کی تکمیل کے لیے وقت، پیسہ اور توانائی ضائع کرتے ہیں۔ ان فضول رسموں کی وجہ سے معاشرتی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے اور یورپ کی ترقی بھی اس لیے ہوئی ہے کہ انہوں نے فضول رسومات کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ ذہنی، علمی اور اقتصادی طور پر قابل تعریف ہے۔ لہذا اگر انگریز ہمیں جانور سمجھتا ہے تو اس میں غلطی ہماری بھی ہے کہ ہم بھی جدید انسان کی خصوصیات سے کوسوں دور ہیں۔ سر سید احمد خان کا سفر نامہ ادبی اور ثقافتی طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یورپ کے کتب خانوں میں ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل تلاش کرنے گیا تھا نا کہ سیر و سیاحت کی غرض سے سفر کرنے گیا تھا۔ مصری عورتوں کی تعلیمی قابلیت کا بھی اعتراف کیا اور ترکی کی ترقی اور تغیر کو بھی بہ چشم حیرت دیکھتے رہے اور ہندوستان واپس آکر مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

اس سلسلے کی ایک اور کڑی علامہ شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم و مصر و شام ہے۔ یہ سفر نامہ علمی و ادبی اور ثقافتی نوعیت کا ہے۔ شبلی نعمانی نے بھی سر سید احمد خان کی طرح مقصدی سفر کیا۔ مصر، روم اور شام کی تہذیب و تمدن کا مشاہدہ کیا۔ وہاں کی درس گاہوں اور کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ بیروت اور بیت المقدس کے علماء کرام سے علمی بحث و مباحثہ کیا ان سے ملاقاتیں کیں اور مشاہیر اسلام پر مستند کتابیں لکھیں۔ ان کے سفر نامے میں

خرد مندی اور علمی رویہ غالب دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے جدید طرزِ معاشرت، انداز تفکر اور نظام سیاست کا بھی مشاہدہ کیا۔ ترکی کے سلطان سے ملاقات کی جس کا اصل محور ہندوستان اور ترکی کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھی۔ مصر کے بازاروں کا جائزہ لیا۔ فرعون کی ممیاں دیکھیں اور ابوالہول کا مجسمہ بھی دیکھا۔ چنانچہ یہ سفر نامہ علمی بصیرت کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر کیا اور وہاں کے حالات و واقعات کو ڈائری کی صورت میں قلمبند کیا جو بعد میں سیر ایران، سخندان فارس کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ بھی علمی ادبی اور ثقافتی مشاہدے کے گرد گھومتی ہے۔

سفر نامے ایک طرح کی تاریخ اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لہذا اگر طاہرانہ نظر کی جائے جو ممکن ہے کہ سفر ناموں نے ہی تاریخ کو جنم دیا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی سفر ناموں نے علم جغرافیہ کی بنیاد رکھی ہوگی۔ کیونکہ سفر نامے میں کسی بھی خطے کی جغرافیائی پوزیشن بیان کی جاتی ہے جس سے یہ امکان غالب ہوتا ہے کہ علم جغرافیہ نے یہیں سے اگر جنم نہ بھی لیا ہو لیکن اس کی اہمیت سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک اور خطے کی نظام سیاست اور لوگوں کی رہن سہن کی وجہ سے تاریخ کے ابتدائی نقوش ابھرے ہیں۔ یعنی جس طرح تاریخ کا تصور اسے تحریر میں لانے کا خیال سفر کے شوق اور سفر ناموں نے ابھارا ہوگا۔ اسی طرح سفر کے ذریعے سے ہی انسان کو نئے ملک، خطے کی جغرافیہ، تہذیب و تمدن اور وہاں کے موسم اور مختلف زبانوں میں اختلاف واختلاط، مماثلت اور تغیر کا علم ہوا ہوگا۔ لہذا سفر نامہ ایک تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ اور سفر نامے میں یہ فرق ہو سکتا ہے کہ تاریخ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ مواد سے ترتیب دی جاتی ہے اور سفر نامہ سیاحت کے حالات و واقعات، مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتا ہے اور سفر نامے میں سیاح تاریخ کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کے پس منظر کو بھی آشکار کرتا ہے اور جغرافیائی حالات کو قلمبند کرتا ہے وہاں کی آب و ہوا، پیداوار، قدرتی مناظر، دریا، پہاڑ، جنگل، صنعت و حرفت، اقتصادی حالات کو بھی بیان کرتا ہے اور وہاں کے لوگوں کی ذہنی رجحان، طبعی میلان، عقائد، ملبوسات کو بھی پیش کرتا ہے جو در حقیقت تاریخ اور تہذیب کے زمرے میں آتا ہے۔ پس سفر نامہ مخصوص عہد کی تاریخ و تہذیب کی سفری دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں خواہ ادبیت ہو یا نہ ہو لیکن معلومات لازمی ہوتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حنیف ندوی، مولانا، افکار ابن خلدون، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، سن، ۱۹۹۵ طبع ششم، ص ۸۳

۲۔ افتخار حسین ، آغا، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع پنجم، جون ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۸۔۱۵۹

۳۔ علی عباس، جلالپوری، مقالات جلالپوری، تخلیقات لاہور، سن اشاعت، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۸

۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، فکشن ہاؤس لاہور، اشاعتِ اول، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۷۔۱۱۶

۵۔ ایضاً ص ۱۳۲۔۱۲۷

۶۔ ایضاً ص ۱۴۰

۷۔ محمد فرقان سنبھلی، انجنیر، مصرِ قدیم، اسلامی کتاب گھر، دہلی، سنِ اشاعت ۲۰۰۳ء، ص ۲۹

۸۔ سبط حسن ، ماضی کا مزار، مکتبہ دانیال کراچی، سنِ اشاعت ۱۹۸۴ء، ص ۱۶

۹۔ محمد فرقان سنبھلی، انجنیر،، مصرِ قدیم، اسلامی کتاب گھر، دہلی، سنِ شاعت، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷

۱۰۔ ایضاً ص ۳۷

۱۱۔ محمد فرقان سنبھلی، انجنیر،، مصرِ قدیم، اسلامی کتاب گھر، دہلی، سنِ شاعت، ۲۰۰۳ء، ص ۸۳

۱۲۔ سبط حسن ، ماضی کا مزار، مکتبہ دانیال کراچی، سنِ اشاعت ۱۹۸۴ء، ص ۲۔۱۷

۱۳۔ سبط حسن ، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیا، کراچی، آٹھویں اشاعت، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳

۱۴۔ ایضاً ۱۳۔۱۴

۱۵۔ ایضاً ۱۴۔۱۹

۱۶۔ Encycopedia Britannica 5th Edition Vol# 12, Copyright 1982, Page-657

۱۷۔ ایضاً ص ۶۵۸

۱۸۔ محمد حیات نصرت، ڈاکٹر، عربی ثقافت کے سماجی پہلو، نظامی پریس لکھنو، ہندوستان، سنِ اشاعت ۱۹۹۸ء، ص ۸

۱۹۔ وزیر، آغا ، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، مکتبہ عزد بان، سرگودھا، ۱۹۹۸ء، ص ۴۴، ۴۳

۲۰۔ محمد حیات نصرت، ڈاکٹر، عربی ثقافت کے سماجی پہلو، نظامی پریس لکھنو، ہندوستان، سن اشاعت ۱۹۹۸ء، ص ۱۲

۲۱۔ ساجد امجد ، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۔۱۱

۲۲۔ انوار ہاشمی ، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۔۲۰

۲۳۔ مجنوں گورکھپوری، شعر اور غزل، ادبی اکیڈمی، دہلی کالونی، سن اشاعت ندارد، ص ۱۰

۲۴۔ ایضاً ص ۱۰

۲۵۔ عبداللہ، سید، اشاراتِ تنقید، مطبوعہ جمال پریس دہلی، سن اشاعت ندارد، ص ۴۰۷

۲۶۔ ادیب، مرزا، سفر نامہ اور تخلیقی فن، اوراق، لاہور، جنوری فروری، ۱۹۷۸ء، ص ۲۰

۲۷۔ سید عبداللہ، سید، ڈاکٹر، سرزمین حافظ و قیام، از مقبول درخشانی، پیش لفظ، ص ۸

۲۸۔ یوسف کمبل پوش، خان، عجائبات فرنگ، نول کشور پریس لکھنو، سن اشاعت ۱۸۹۸ء، ص ۱۹

۲۹۔ ایضاً ص ۹

۳۰۔ ایضاً ص ۸۰

۳۱۔ سید احمد خان، سر، مسافرانِ لندن، مرتب، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، سنِ اشاعت ۱۹۶۱ء، ص ۱۱

۳۲۔ ایضاً ص ۱۹۲

۳۳۔ ایضاً ص ۲۴۰

باب دوم:

اردو سفر ناموں پر مصری تاریخ کے اثرات کا تجزیہ

اردو سفر ناموں کا آغاز انیسویں صدی میں ہوتا ہے اور تاحال تحقیق کے مطابق عجائبات فرنگ کو اردو کے اولین سفر نامے کا درجہ حاصل ہے۔ ہر چند کہ اس سفر نامے کی زبان پرانی ہے لیکن اس میں سادگی، سلاست اور دردمندی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس کے مصنف یوسف کمبل پوش جرمنی، پیرس، انگلستان اور دیگر ممالک کے ساتھ مصر بھی گھومنے گئے تھے۔ اس کے سفر نامے میں جہاں دیگر ممالک کی رونقیں پڑھنے کو ملتی ہیں وہاں پر مصر کی تاریخ اور سیاست بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کا مصر کے ساتھ مذہبی لگاؤ بھی ہے اور چونکہ مصری تہذیب دنیا کی اولین تہذیب میں سے ایک ہے اس لیے برصغیر کے باشندوں کا اس سے تہذیبی و تاریخی لگاؤ بھی ہے۔

مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا گیا، وہ وہیں قید و بند میں رہے اور پھر وہاں کے وزیر بھی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بھی باعث دلچسپی ہے۔ الغرض مصر کے ساتھ دلچسپی کے اسباب تہذیبی، مذہبی اور زمانی و مکانی بھی ہیں۔ اس لیے اردو سفر نامے میں اس کا ذکر آغاز سے ہی ملتا ہے۔ یوسف کمبل پوش نے مصری تاریخ اور واقعات کو جس انسانی ہمدردی سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چونکہ یوسف کمبل پوش بھی غلام ہندوستان کا شہری تھا۔ اس لیے اس کو غلامی کی ذلت کا بھی اندازا تھا، لہذا وہ مصر کی حکمرانی پر جس انداز میں رقم طراز ہیں وہ خود باعث فخر ہے۔ وہ مصر کے سیاسی حالات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمد علی شاہ خدیو مصر کا ملک فتح کرنا چاہتا ہے۔ اس کے زن و مرد کو پکڑتا ہے۔ ان کو درمائے کے عوض سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ہر سپاہی ان کو اس بازار میں لا کر ان ظالموں کے ہاتھوں کم قیمت میں بیچ دیتا ہے۔[1]

اس عبارت سے دو چیزیں عیاں ہوتی ہیں کہ ایک مصر کی تاریخ سے اردو سفر نامہ نگاروں کی دلچسپی اور واقفیت دوم مصری عوام کی حقیقی آزادی کے لیے پریشان ہونے کا عنصر۔ الغرض مصر ہم سے مکانی لحاظ سے بہت دور ہے لیکن قلبی اعتبار سے قریب تر ہے اور قربت کو کم و بیش تمام سفر نامہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مصر کی تاریخ سے ہماری وابستگی اور دل چسپی قدیمی ہے۔ اسی طرح سر سید احمد خان کے سفر نامے میں مصر

کی تاریخ کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور شبلی نعمانی کے سفر نامے میں بھی تاریخی واقعات اور اسباب کی بہتات ملتی ہے، فراعنہ کی تاریخ اور دیگر تاریخی عمارات، آثارِ قدیمہ اور کتب خانوں کی روایت پر مفصل تبصرہ ملتا ہے۔ نیز ان کے سفر نامے میں قاعرہ، جامعہ ازہر کے ساتھ قدیم مزارات اور یادگاری عمارات کا بیان بھی ملتا ہے۔ شبلی نعمانی جامع ازہر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> یہ وہ ہی جامع ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کل دنیا میں اس سے قدیم کوئی یونیورسٹی نہیں ہے یہ ایک جامع مسجد ہے اور قاہرہ میں سب سے پہلے مسجد جو تعمیر ہوئی وہی فاطمین مصر میں سے خلیفہ المعز الدین اللہ کے ایک غلام نے جو سسلی کا رہنے والا تھا اور اپنی قابلیت خداداد سے دولت فاطمیہ کا دستِ بازو بن گیا تھا ۳۸۹ ہجری میں اس مسجد کی بنیاد ڈالی۔ (۲)

اسی مسجد کے صحن میں چند مکانات بنوائے گئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا اور بعد کے حاکم امیر طواشی نے یتیم بچوں کے لیے مخصوص مکتب قائم کروایا اور رفتہ رفتہ جامع ازہر ایک بڑا دار لعلوم کی صورت اختیار کر گیا۔ یہاں مصر کے علاوہ دور دراز سے بھی طلباء تدریس کی غرض سے مقیم تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادارہ دنیا کی بہترین یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر گیا۔ چنانچہ یہ مصر کی سب سے قدیم اور پرانی پونیورسٹی ہے جہاں سے ہر سال لاکھوں طلبا سند حاصل کرتے ہیں اور دین و دنیا کی خدمت میں اپنا مقدور بھر حصہ ڈالتے ہیں۔ شبلی نعمانی کے سفر نامے میں مقامات اور مزارات کی تاریخ بھی ملتی ہے اور اس کی موجودہ صورت حال بھی ملتی ہے کہ وہ مقام موجودہ حالات میں کس نوعیت کا ہے۔

یہ چیز ثابت کرتی ہے کہ مصر کی تاریخ سے ہماری دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لہذا اپنے موضوع کے لحاظ سے جدید سفر ناموں میں مصری تاریخ کے خدوخال اور روایات کو تلاش کرنا ہے اور ان پر تجزیے کو سمیٹنا بھی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا سفر نامہ حسن مصر زیر مطالعہ ہے۔ یہ سفر نامہ سنگری فیصل آباد سے ۲۰۱۸ میں شائع ہوا۔اس سفر نامے کی خوبی یہ ہے کہ اول سے آخر تک مصر سے جڑا ہوا ہے۔ جبکہ مصنف نے دیگر کتابوں سے تاریخی حوالے سے بھی رقم کیا ہے اور سفر نامے کو تاریخ کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے ساتھ میں مزاح کی چاشنی بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور اس سفر نامے میں بے ساختہ پن اس کی اہم خاصیت ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا سفر نامہ نیل کے سنگ زیر بحث رہے گا۔ مصنف خود بھی ادیب ، معلم اور مترجم ہیں اس سفر نامے سے قبل ان کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور خود یونیورسٹی کے معلم بھی رہ

چکے ہیں۔اس لیے ان کی تحریر میں علمی و ادبی فضا بھی قائم ہے۔ یہ سفر نامہ حسن ادب فیصل آباد سے ۲۰۲۲ء میں شائع ہوا۔

محمد رفیق ڈوگر کا سفر نامہ "اور نیل بہتا رہا" اپنی جاذبیت اور نثر کے حوالے سے انفرادیت کا حامل ہے جبکہ یہ سفر نامہ بلدادِ یورپ سے مصر تک مشتمل ہے۔اس سفر نامے میں لندن، مانچسٹر، پیرس کی سیاست کے بعد مصر کی جانب رختِ سفر باندھا گیا ہے۔ نیز مصر کے حوالے سے ستر سے اسی صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن پورے سفر نامے کا عنوان نیل بہتا رہا منتخب کیا گیا ہے جس کو سنگِ میل لاہور سے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا گیا ہے۔

ایک اور سفر نامہ "مصر کا بازار" جس کے مصنف یعقوب نظامی ہیں، اس سفر نامے کو مشتاق بک کارنر لاہور سے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا گیا ہے۔ مصنف انگلستان کے شہر بریڈ فورڈ میں آباد ہیں جبکہ ان کا آبائی گاؤں سلواہ ہے جو مقبوضہ کشمیر ضلع پونچھ کی تحصیل مہنڈر میں واقع ہے۔ مصنف کی دیگر تصنیفات میں پاکستان سے انگلستان تک، پیغمبروں کی سرزمین، انگلستان میرا انگلستان اور ایک صدی کی بات اعتباعت کے لمس سے آشنا ہو چکی ہیں، اس سفر نامے کا آغاز برطانیہ سے براستہ اٹلی سے کیا گیا ہے یہ سفر نامہ ابتداء سے اختتام تک مصر، فراعنہ اور اس کی فضا کو سمیٹے ہوئے ہے۔

ہمارے اس مقالے میں شامل آخری سفر نامہ محمد سعید جاوید کی تحریر کردہ مصریات ہے۔ اس سفر نامے کو ۲۰۱۶ء میں بک ہوم لاہور سے شائع کیا گیا۔ مصنف اس سفر نامے سے قبل اپنی خود نوشت "اچھی گزر گئی" سے ادبی دنیا میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ ریل کی جادو نگری، ایسا تھا میرا کراچی بھی منسہ شہود پر آچکی ہیں۔اس سفر نامے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جس سے قاری کی معلومات میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔اس سفر نامے میں مصر کے تمام تاریخی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تہذیب و تمدن، رہن سہن، ماضی اور حال پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان تمام سفر ناموں میں مصر کے حالات و واقعات، سیاحت، تہذیب و تمدن کے نقوش گہرائی و گیرائی سے دکھائی دیتے ہیں موضوع میں تنوع، تجربات میں یگانت اور انفرادیت کے ساتھ سفر کے تاثرات بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ان سفر ناموں کی خوبی یہ ہے کہ سفر نامہ نگاروں نے مصری تاریخ، تہذیب اور حالاتِ فراعنہ کو اپنے اپنے انداز سے سمجھنے اور تاثیر کو بیان کرنے کی سعی کی ہے اور ان سفر ناموں کے توسط سے اردو سفر ناموں میں گراں اضافہ بھی ہوا اور اضافہ تعداد کے ساتھ کھیت میں بھی اضافے کا باعث بنیں گے۔ لہذا ہمارا تحقیقی مقالہ ان سفر ناموں کی ستون پر استوار ہے۔

واقعات فراعنہ:

مصر کا نام لیتے ہی ذہین پر فرعون، اہرام اور حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف کے نام نمودار ہوتے ہیں۔ مصر کے بادشاہوں کو فرعون کہا جاتا تھا۔ جس سے مراد زمین اور آسمان کا خدا تھا یا دیوتاؤں کی اولاد تصور کیا جاتا تھا۔ لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی پوجا بھی کیا کرتے تھے۔ نیز فرعون کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی تفصیل سے موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ حق دیا تو وہ ناراض ہو گئے اور پھر خدا تعالیٰ نے فرعون کو دریائے نیل میں غرق کر دیا۔ یہ مذہبی پہلو ہے جس میں ہمارا پختہ یقین اور ایمان ہے۔ دوسرا تاریخی پہلو ہے جس پر مورخین اور ماہر آثارِ قدیمہ نے تحقیق کی ہے۔ چنانچہ دنیا کے عجائبات میں اہرام اور ممیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ہر سیاح نے ان کے مزارات کو دیکھا بھی ہے اور تاحالِ دنیا کے لیے باعث عبرت اور حیرت ہے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر محسن گھیانہ نے واقعات فراعنہ کو یوں رقم کیا ہے کہ:

> ایک رات فرعون نے خواب دیکھا کہ دو درخت عالم بالا پر گئے۔ اس کے بعد ساری دنیا ان کے تابع ہوئی۔ صبح اٹھا تو خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ ماہر حکیم، سنجم جادو گر و جوتشی دربار میں حاضر ہوں سب حاضر ہوئے تو پوچھا کہ رات کو ایک ایسا خواب آیا ہے۔ (۳)

ڈاکٹر محسن نے فرعون کا یہ واقعہ ان کے محل کو دیکھ کر لکھا ہے جو دراصل تاریخ میں بیان ہے کہ فرعون نے خواب دیکھا اور پھر بنی اسرائیل پر پابندی عائد کر دی کہ کوئی بھی مرد اپنی بیوی کے ساتھ نہیں سوئے گا لیکن عمران کے گھر بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی حکم الٰہی سے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کے سپرد کر دیتی ہے جس کو فرعون کے گھر پر ہی پروان چڑھنا تھا۔ مصنف نے فراعنہ کے داستان میں یہ قصہ تاریخ اور قرآن کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے قبل فرعون کا محل دیکھتے ہیں جو انھیں گائیڈ دکھاتی ہے۔

> جو سامنے آپ کو محل نظر آرہا ہے یہ لکڑی کے پل کے ساتھ ہی ہے۔ یہ اس فرعون کا ہے جس کے محل سے حضرت موسیٰ □ پلے بڑھے اور اسی دریائے نیل میں ننھے منھے بچے کی صورت میں حضرت موسیٰ تیرتے ہوئے آئے تو انہیں اسی محل میں جگہ ملی جہاں پر اعلان ہو چکا تھا کہ مصر میں بچوں کو پیدا ہوتے ہیں مار دو۔ (۴)

مصنف لکھتے ہیں کہ اس محل کو دیکھتے ہی ذہن میں تاریخ کے اوراق پلٹنے شروع ہو گئے وہ فرعون جو خود کو اپنے علاوہ کسی کو بادشاہ یا خداوندی نہیں مانتے تھے وہ آج دنیا بھر کے لیے عبرات کا نشان بنے ہوئے تھے اور دنیا بھر سے لوگ ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے تھے۔ سفر نامہ نگار کی تحریر میں سنجیدگی در آتی ہے اور وہ یک بعد دیگرے تاریخ کے اوراق پلٹنے شروع کر دیتے ہیں یہ سفر نامہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں واقعات کے تسلسل کے ساتھ تاریخی حوالے بھی ملتے ہیں۔

محمد سعید جاوید نے اپنے سفر نامے مصریات میں ان کے واقعات اور حالات کو بڑی جاذبیت سے پیش کیا ہے:

> یہ فرعون رامیس ثانی کہلاتا ہے اور بلاشبہ یہ سب سے لمبے عرصے تک مصر پر حکومت کرنے والا بادشاہ تھا۔(۵)

اس طرح تعارف کروانے کے بعد ان کی تاریخ اور واقعات قلمبند کرتے ہیں، جس میں اسلامی تاریخ کو فوقیت دی جاتی ہے یہ فرعون تورات اور انجیل کے مطابق اکانوے برس تک مصر پر حکومت کرتا ہے اور طبع موت مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس کو آرام و سکون میسر نہ ہوا اس کے جسدِ خالی کو تابوت سے نکال کر نمائش، تحقیق اور دیمک وغیرہ کے علاج کے نام سے دنیا بھر میں گھمایا گیا اور جہاں گیا عبرت کا درس دیتا رہا اور قاہرہ میں لا کر عجائب گھر کی زینت بنایا گیا چونکہ وہ تاریخ میں بادشاہ تھے اس لیے ان کے جسم کو بادشاہ کا درجہ دیا گیا۔

> ہر چند کہ وہ ایک لاش ہی تھی لیکن دنیا کی نظر میں بہر حال وہ اپنے وقت کا عظیم شہنشاہ تھا لہذا اسے جہاں کہیں بھی لے جایا جاتا اس کے ساتھ بادشاہوں والا سلوک ہی ہوتا تھا اور اس کے تابود کو میزبان ملک نہ صرف سرکاری پروٹوکول دیتا بلکہ اسے شاہی سلامی بھی پیش کی جاتی۔(۶)

ویسے تاریخ میں کئی فرعون گزرے ہیں لیکن جو مقبولیت و حرذالناس کو ملی ہے اس کو کوئی نظیر نہیں ہے۔ مذہبی تناظر سے ہٹ کر بھی دنیا بھر نے اس کی لاش پر تجربات کیے ہیں اور وقت کے ہاتھوں مسلسل تباہ ہوتے ہوئے جسم کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نیز عجائب گھر میں اس مجسمہ رکھا گیا ہے اور دیگر تفصیلات بھی قدیم زبان میں قلمبند کی گئی ہیں۔ نیز فرعون مصری تاریخ کا اٹوٹ حصہ ہیں جنھیں صرف مذہبی عقائد کی بنا پر رد نہیں کیا جا سکتا۔

مصر دریائے نیل کے کنارے پر آباد ہے اور مصر کا قدیم نام قبطہ ہے یہاں کے قدیم باشندے خود کو قبطی کہلاتے تھے۔ چنانچہ متذکرہ سفر ناموں میں فراعنہ کے واقعات تفصیل کے بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک محدود ہیں۔ اس لیے تاریخی تشنگی رہتی ہے۔ ویسے بھی سفر نامہ تاریخی واقعات بیان کرنے کی خوبی رکھتا ہے لیکن مکمل اور جامع تاریخ پیش نہیں رکھتا۔

بادشاہی نظام:

انسانی معاشرے نے جب ترقی کی اور تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی تب رفتہ رفتہ طبقاتی نظام نے بھی جنم لیا اور انسانی معاشرت پر بادشاہی نظام کے قدم مستحکم ہونے لگے۔ ویسے نظام پر علم بشریات اور ماہر عمرانیات نے تفصیل سے بحث کی ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے کہ انسان نے مطلق العنان حکومت کی بنیاد رکھی اور کوئی بھی اس کے خلاف صدیوں تک اٹھ کھڑا نہ ہوا۔ پھر جوں جوں پیداواری ذرائع میں تبدیلی آتی رہی ویسے ویسے اس نظام کا بھی خاتمہ ممکن ہوا۔ بادشاہ اپنے خطہ کا بڑا ہوتا تھا جو عوام کی بھلائی اور بہتری کے لیے مشترکہ اقدامات اٹھاتا تھا لیکن جو طاقت نے اس کو مطلق العنان بنا دیا، لہذا انسانی تاریخ میں بادشاہی نظام ظلم و بربریت کی مثال ہے۔ دنیا میں جہاں دیگر خطوں میں بادشاہت قائم ہوئی وہاں پر مصر میں بھی شخصی بادشاہت کے نقوش ملتے ہیں۔ چونکہ مصر دریائے نیل کے کنارے پر آباد ہے اس لیے اس کی خوش حالی اور زرخیزی کی وجہ سے بادشاہت کو مزید تقویت ملی۔ جس کی تاریخی مثال فرعون کا وجود ہے۔

اردو سفر ناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سفر نامہ نگار نے ملک کے حالات اور واقعات کو تاریخی واقع کے حوالے سے قلمبند کر کے قاری کو تاریخ اور سیاحت سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا ہے لہذا مصر انقلابات سے گزرتا رہا اور اس کا آخری بادشاہ شاہ فاروق تھا۔ مصر پر فراعنہ کی بادشاہت کو یعقوب نظامی نے یوں لکھا ہے:

> مصر پر فراعنہ کے تین ہزار سالہ دور کا آغاز ۳۲۰۰ قبل مسیح میں ہوا، اس سے پہلے مصر چھوٹی چھوٹی علاقائی ریاستوں میں تقسیم تھا، کوئی بھی مرکزی حکومت نہیں تھی، فراعنہ حکومت بادشاہ مینس Menes نے متحدہ مصر کی بنیاد ڈالی اور قاہرہ سے پندرہ میل دور ممفیس میں قائم ہوا۔[۷]

مصر کے بادشاہ خود کو فرعون کہلاتے تھے اور ارضی و سماوی خدا سمجھتے تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ممیں مصری حکمرانوں نے بہت بعد اپنے لیے فرعون کا لقب استعمال کیا۔ دراصل یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے

جس کے معنی گریٹ ہاؤس یعنی بڑا مکان یا شاہی محل کے ہیں۔ شاید بڑے گھر یا مکاں میں رہنے والے ہر شخص کو کہا جاتا تھا لیکن رعمیس حکمرانوں نے یہ لقب بادشاہوں کے لیے مخصوص کر دیا ہو، چنانچہ تاریخ میں انھیں فرعون ہی لکھا جاتا ہے۔ بہت عرصے تک انھوں نے بادشاہت کی اور انھوں نے ہی اہرام بنانے کی بنیاد رکھی۔ الغرض ان کی بادشاہت اور بادشاہوں کا وجود جاہ و جلال کی علامت بن کر ابھرے، جنھیں اس وقت عوام پوجتے بھی تھے اور احترام بھی کرتے تھے۔ خواہ یہ احترام عدل و انصاف کی وجہ سے نہ بھی ہو، لیکن طاقت اور سپہ کی وجہ سے تو تھا۔ لہذا سب سے طویل مدت تک حکمرانی یا بادشاہت فراعنہ خاندان نے کی۔

> فراعنہ کو جب زوال آیا تو یونانیوں نے ملک پر قبضہ کر کے ۳۰۲ تک حکومت کرتے رہے۔ پھر رومن آئے جنھوں نے ۳۰ سال قبل مسیح ۶۳۸ تک حکومت کی، رومن حکمرانوں کو مسلمانوں نے ۶۴۰ میں شکست دے کر مصر پر قبضہ کیا۔[۸]

فراعنہ کے زوال کے بعد یونانیوں نے اپنی بادشاہت قائم کی اور انھوں نے اس ملک کو علم کا مرکز بھی بنایا۔ حنوط میں تغیر لے کر آئے، رومن نے اس کو مزید وسعت دی، زراعت میں بھی تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت عمر کے عہد میں مصر کو فتح کیا گیا اور مصر کے لوگوں کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھا گیا۔ یہاں پر مساجد اور مدارس کا نظام متعارف کروایا گیا۔ جامع الازہر جس کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں ہر سال ہزاروں طلبا کو سند دی جاتی ہے۔ نو سو سال تک عرب کی حاکمیت اور حکمرانی رہی اور علم و ادب کا مرکز بنا رہا پھر عثمانی سلطنت نے حکومت کی انھوں نے بھی کم و بیش ساڑھے تین سو سال حکمرانی کی۔ درمیاں میں چار سال کے لیے فرانس قابض ہوا لیکن پھر عثمانیہ حکومت غالب آ گئی۔

عثمانیہ حکومت نے قاہرہ کو بڑی اہمیت دی جبکہ صلاح الدین ایوبی نے بھی اس کو فتح کیا تھا اور اس کی تقدیر بدل دی تھی۔ انھوں نے ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا تھا تاکہ اس شہر کو صلیبی جنگوں اور یورش پسندوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ لہذا مصری حکمرانوں نے سلطان صلاح الدین ایوب کی تعمیر کردہ قلعہ سے کم و بیش سات صدیوں تک اہل قاہرہ کی حفاظت کی گئی۔ نیز مصر پر فراعنہ، رومی، یونانی اور مسلمانوں نے حکومتیں قائم کی تھیں بلکہ شکسپیئر چولیس سیزر کا کردار بھی مصر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ جہاں اس کو دھوکے سے مارا جاتا ہے اور اس کا دوست بروٹس بھی اس سازش کا حصہ ہوتا ہے اور یہ جملہ "بروتس تم بھی! انسانی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

چنانچہ برطانیہ نے جب اس پر قبضہ کیا۔ تقریباً چالیس سال کے بعد محدود آزادی، جس کی وجہ سے عباس حلمی بھی شراکت دار رہے۔ عباس حلمی کی وفات کے بعد اس کے بیٹا فہدِ نے اقتدار سنبھالا جس کے بعد

بادشاہ فاروق تخت نشین ہوا۔ یہ وہ ہی بادشاہ تھا جس کا ایران کے بادشاہ پھلوی خاندان سے مراسم تھے اور اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ شہنشاہ ایران کے بیٹے کو دیا تھا لیکن وہ زیادہ وقت تک چل نہیں سکا۔ نیز بادشاہ فاروق کی بیٹی کا یہ کہنا تھا کہ ایرانی ابھی بادشاہت کے فن سے نابلد ہیں۔

بادشاہ فاروق کو عبد جمال ناصر نے معدول کر کے ملکی حکومت کی باگ دوڑ اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ جمال نامہ اس عہد میں جمہوریت اور انقلاب کی علامت بن کر ابھرے تھے۔ انھوں نے شاہی قوانین کو ختم کر دیا تھا۔ لہذا ان کا زمانہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۰۰ تک پر محیط ہے۔ یہ قلیل اور گیارہ سال کی حکومت کے بعد حسنی مبارک اقتدار پر اجمال ہوئے جبکہ انور سادات کو گولی مار کر قتل کیا گیا تھا۔ مصر میں اس وقت دیگر ممالک کی طرح صدارتی نظامی رائج ہے۔ عوام ووٹ دے کر منتخب کرتے ہیں اور صدر دس ممبران کو نامزد کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

مصر والے اپنے ملک کو "ام دنیا" کے نام سے پکارتے ہیں ام کے معنی ماں کے ہیں یعنی اہل مصر خود کو دیگر دنیا سے ممتاز تصور کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاہد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب ساری دنیا پتھر کے عہد میں سانس لے رہی تھی تب مصر والے پتھر کے دور کو خیر آباد کہہ کر دھات کی دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔ مصر بھی دیگر تہذیبوں کی طرح نشیب و فراز سے گزرتا رہا اور حکمرانوں کی ذاتی پسند اور خواہشات کو دوام بخشتا رہا۔

انبیاء اور صحابہ کے واقعات:

مصر کی سرزمین کے ساتھ جہاں فرعون کا تذکرہ ملتا ہے وہیں پر آل یعقوب کا ذکر بھی زبانِ زدِ عام ہے۔ یہ ذکر نہ صرف تاریخ کی کتابوں کا حصہ بن چکا ہے بلکہ مقدس کتابوں کے علاوہ قرآن پاک میں بھی حضرت موسیٰ اور فرعون کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے اور مصر کے بازاروں میں ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا گیا تھا۔ جنھیں عزیز مصر نے خریدا تھا۔ جس کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے۔ نیز جب لوگ سیاحت کے لیے مصر جاتے ہیں تب ان مقامات اور عجائبات کو بھی دیکھتے ہیں اس ضمن میں سفر نامہ نگار ڈاکٹر محسن میگھانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے قلمبند کیا ہے اور اپنے واقعات کو بیان کرتے وقت جابجا قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ نیز حضرت موسیٰ کی پیدائش کا واقعہ انھوں نے یوں قلمبند کیا ہے کہ فرعون نے پہلے ہی حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے یہاں کوئی بھی مرد اپنی بیوی کے ساتھ نہیں سوئے گا کیونکہ نجومیوں نے اسے خواب کی تعبیر میں بتایا تھا کہ ایک لڑکا بنی اسرائیل میں سے آپ کی موت

کے خاتمے کا سبب بنے گا۔ اس پابندی کے بعد بھی وہ بچہ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور فرعون غرق ہوا۔ لہذا محسن میگھانہ نے سفر نامے میں لکھا ہے کہ :

> اس کی بیوی تمام رکاوٹیں عبور کرتی ہوئی فرعون کی خواب گاہ تک آ پہنچی پہلے ان دونوں کے ہاں ایک بیٹا اور بیٹی پیدا ہو چکے تھے بیٹے کا نام حضرت ہارون علیہ السلام اور بیٹی کا نام مریمؑ تھا۔ عمران نے بھی دیکھا کہ فرعون بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے تو وہ چپکے سے وہاں سے کھسک لیا اور پھر دونوں میاں بیوی کا وہیں فرعون کے محل کے ایک خالی کمرے میں ملاپ ہوا۔[۹]

فرعون نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ کہیں بھی لڑکا پیدا نہ ہو لیکن مشیت ایزدی کے سامنے شخص کی کیا حیثیت ہے۔ فرعون کی تمام تر کوششیں اور حکمت عملیاں ناکام ہوئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب جنم لیا تب بھی معجزاتی طور پر غاصب فرعون کے ظلم سے محفوظ رہے بلکہ ان کے ہی گھر میں پرورش پائی۔ فرعون کی بیوی آسیہ نیک عورت تھیں اس نے صندوق سے اس بچے کو نکالا اور پرورش کر کے بڑا کیا۔ نیز فرعون کے محل میں حضرت موسیٰ کو دودھ بھی اپنی والدہ کا نصیب ہوا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ میگھانہ نے حضرت موسیٰ اور فرعون کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جو سفر نامے کی بجائے تاریخ کا احاطہ کرتی ہے اور جہاں جہاں ضرورت محسوس کی وہاں پر قرآنی آیات کو بھی حوالے کے لیے پیش کیے ہیں۔ اس ضمن میں محمد سعید جاوید یوں رقم طراز ہیں:

> ہر چند کہ مقدس کتابوں میں کسی فرعون کا نام ظاہر نہیں کیا گیا لیکن زیادہ تر روایات اسی فرعون یعنی رعمیس ثانی سے ہی منسوب ہیں جس نے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم بنی اسرائیل پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ اس کی فوجوں نے جن کی کمان یہ خود کر رہا تھا ان کو مصر سے نکال کر ان کا پیچھا کیا اور انہیں دھکیلتے ہوئے بحیرہ احمر تک لے گئے جہاں اللہ کے حکم سے سمندر نے دولخت ہو کر حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھوں کو راستہ دیا اور وہ سمندر سے صحیح سلامت دوسری طرف نکل گئے۔[۱۰]

مصر کی زمین کے ساتھ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا قصہ تاریخ کی کتابوں میں بھی درج ہے۔ نیز فرعون کا نام درج نہیں ہے لیکن قیاس غالب ہے کہ وہ رعمیس ثانی تھے جبکہ چند روایت کے مطابق فرعون خود سمندر میں نہیں اترتے تھے، وہ پہاڑ کی چوٹی سے اپنی فوجوں کو ہدایت دیتے رہے اور اس نے اپنی فوج کو سمندر

میں اترنے کا حکم دیا، جو غرق ہو گئے۔ الغرض فرعون سمندر میں اترے تھے یا نہیں لیکن تاریخ میں عبرت کا مقام بن گئے۔ بعض مؤرخین کی روایات کی مطابق حضرت موسیٰ اور اس کی قوم کے نکل جانے کے بعد اہل مصر پر عذاب ٹوٹ پڑا۔ مدتوں قحط سالی کا سلسلہ جاری رہا۔

سفر نامہ نگار یعقوب نظامی نے بھی حضرت موسیٰ کے واقعات کو اسلام کی روشنی میں درج کیا ہے اور انھوں نے چند بنیادی اور اضافی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ جس میں قارون کا ذکر بھی شامل ہے۔ سیاحت کے دوران انھوں نے وہ ڈیلٹا یا مقام دیکھا جہاں قارون رہتے تھے۔

> فرعون کا وزیر خاص قارون بھی ڈیلٹا کے اسی علاقے میں مقیم تھا۔ بعض علما کا خیال ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کا کزن تھا، جو امیر ترین اور انتہائی کنجوس آدمی تھا، اپنی قوم بنی اسرائیل پر ظلم کرنے میں فراعنہ کی مدد کرتا تھا۔[11]

سفر نامہ نگار یعقوب نظامی نے دوران سیاحت ان تمام مقامات کو دیکھا اور مشاہدہ بھی کیا جس کا واسطہ حضرت موسیٰ سے تھا، انھوں نے صحرائے سینا کو بھی دیکھا اور اس کی سیاحت بھی کی۔ صحرائے سینا کے لیے مشہور رہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے لیے چشمے رواں کیے تھے، دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے اپنے ساتھیوں کو نکال کر آئے تھے تب انھوں نے صحرا سینا میں قیام کیا تھا اور وہاں پانی کی طلب ہوئی تب حضرت موسیٰ نے پتھر پر اعصا مارا جہاں سے چشمے رواں ہونے لگے اس مقام کو یا ان چشموں کو عین موسیٰ بھی کہتے ہیں۔ لہذا وادی سینا کے راستے قاہرہ سے سویز نہر کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے سفر نامہ نگار نے سفر کی تمام جذیات بھی بیان کی ہیں اور غلطی سے تین میل آگے نکل گئے تھے اس کو خوب صورت دل کش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

جب ان کو پولیس والے نے درست راستہ بتایا تب انھوں نے اپنی گاڑی سڑک سے دائیں جانب موڑ دی اور پھر اسٹال پر کھڑی بدو لڑکی سے دریافت کیا انھوں نے سیاحت کی غرض سے آنے والے مہمانوں سے کہا کہ میری اسٹال سے کچھ خرید لو تب بلا معاوضہ ان چشموں کی سیر کرواؤں گی۔ سفر نامہ نگار نے بدو لڑکی کی خاکہ نگاری خوب صورت اور دل کش انداز میں پیش کی ہے جس پر مرصع سازی اور پیکر کشی کا گمان ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ نگار کی خوبی ہے کہ اپنے قلم سے مرصع سازی اور پیکر کشی کرتے ہیں اور سیاحت کے ساتھ ساتھ ظرافت کے چٹکلے رقم کر دیتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ یہاں حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے بارہ قبائل کے لیے بارہ کنویں کھدوائے تھے جن میں سے پانچ ریت اور مٹی سے بھر گئے ہیں مگر سات اب تک موجود ہیں ہم نے وہ سات کنویں دیکھے جن میں پانی بھی نظر آرہا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کنویں باقاعدہ کھدائی کر کے تیار کیے گئے ہیں۔(۱۲)

یہ قدرت کا معجزہ ہے کہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی صحرا کے قلب میں ان چشموں کا ذکر موجود ہے کہ ایک چٹان سے بارہ چشمے نکلے تھے اور کسی نے بھی کنویں نہیں کھودے تھے۔ جبکہ چاروں طرف صحرا ہی صحرا تھا، کہیں پر بھی چٹان کا نام و نشان نہیں تھا۔ سفر نامہ نگار کی نگاہ بھی چٹان کی متلاشی تھی۔ البتہ کوہ طور سے واپسی پر ان کو وہ چٹان نظر آ گئی۔

تب رفیدیم کے قریب "حورت" کی وہ مشہور چٹان دیکھی جس کے بارے میں مقامی لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ نے اسی چٹان پر عصا مارا اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔(۱۳)

چنانچہ محمد سعید جاوید کے سفر نامے "مصریات" میں ان مقامات کی تفصیل موجود ہے اور سفر کی پیچیدگیاں، لطافت اور مقامی لوگوں کے ساتھ بات چیت کا اصول بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی تحریر کا حسن یہ ہے کہ جگہ جگہ موازنہ بھی کرتے ہیں اور کوئی ایسا چٹکلا بھی چھوڑ جاتے ہیں جس میں ظرافت کے ساتھ فہم و دانش کی بات پوشیدہ ہوتی ہے۔ سفر نامہ نگار نے موسیٰ جبل جس کو ہم کوہ طور کہتے ہیں کا ذکر بھی رقم کیا ہے اور اس دوران جو نام میں غلط فہمی ہوئی اس پر جو جملوں کا تبادلہ ہوا وہ بھی انتہائی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ نیز دوران سیاحت نقشوں کا علم ہونا بھی لازمی امر ہے۔ ورنہ سیر و تفریح اور سیاحت کا سارا لطف غارت جائے گا۔ ویسے بھی جغرافیائی علم کے بغیر سیاحت بے سود ہے۔

عام روایات کے مطابق بنی اسرائیل پر حضرت موسیٰ کی دعا سے خدا کی جانب سے من و سلویٰ عطا کیا گیا جہاں من و سلویٰ عطا کیا گیا وہ مقام صحرا ہی صحرا تھی اور اس مقام کو بائبل میں "بیابان سین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر دو بڑے مسائل تھے ایک انتہائی دھوپ اور دوسرا کھانا اور یہ دونوں چیزیں صحرا میں ملنی ناممکن تھیں تب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے چالیس سال تک بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اترتی رہی تاوقت کہ انھوں نے خود ایک ہی کھانا کھانے سے انکار نہیں کیا۔ چنانچہ سفر نامہ نگار یعقوب نظامی نے اپنے سفر نامے "مصر کا بازار" میں اس مقام کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں:

المرخہ کی اسی وادی میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ابر کا سایہ کیے رکھا اور اسی دوران انہیں کھانے کے لیے من و سلویٰ عطا کیا۔ جب تک آپ خود اس مقام کو دیکھ نہیں لیتے بنی اسرائیل کی مشکلات کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں انتہائی گرمی کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی اشیاء کا ملنا مشکل ہے۔[۱۴]

چنانچہ سفر نامہ نگار نے اس مقام کو دیکھا اور اس مقام کی مشکلات کا مشاہدہ بھی کیا بلکہ اس کی گرمی اور پیاس کی شدت کو محسوس بھی کیا کہ یہاں بغیر کھانے پینے اور سایے کے رہنا کس قدر مشکل ہے اور صحرا پر ویسے بھی گرمی پوری آب وتاب سے نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ مصنف نے اس وادی المرخہ کی اذیت کو بھی پیش کیا۔ تاریخ میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ وادی طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے تھے۔

مصنف نے اس پورے سفر کی روداد بیان کی ہے کہ کس طرح وہ راستے میں پہاڑوں سے محظوظ ہوتے رہے اور سرخی مائل پہاڑوں کے درمیان سفر کرتے رہے۔ دھب اور یہاں سے نوبیا کا رخ کرنا۔ راستے میں بدوں کا اونٹنیوں کے ساتھ ایک قافلہ بھی رواں دیکھا غرض کے مصنف مقدس مقامات کی زیارت کے ساتھ ساتھ سفر طے کرتے ہوئے وہ اس مقام تک پہنچے جس کو کوہ طور کہتے ہیں نیز اب اس علاقے کو سینٹ کیتھرائن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سینٹ کیتھرائن کے حدود میں داخل ہونے کے بعد انھیں پیدل جانے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ آگے گاڑی لے جانا ممنوع ہے۔ مصنف اپنے دوستوں کے ساتھ سینٹ کیھترائن کے علاقے میں داخل ہوا:

وہ پاس گئے تو ایک بورڈ پر لکھا تھا مقام بنی اللہ حضرت صالح ہم سب مقام بنی اللہ صالح علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی نما کمرہ تھا۔ جس کی دیواریں اندر اور فرش بالکل کچا تھا۔ کمرے کے درمیان ایک قبر کے اوپر چادرین تھیں۔ قبر کے سرہانے کی طرف دیوار میں ایک چھوٹا سا طاق تھا جس میں ایک دیا تھا۔ جسے غالباً کوئی اللہ کا بندہ کبھی کبھار روشن کر کے اپنا فرض پورا کرتا ہو گا۔[۱۵]

حضرت صالح علیہ السلام اللہ کے بڑے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ جس کی اونٹنی کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ لیکن اس قوم ثمود نے اونٹنی کو مار ڈالا اور خدا کے عذاب کا مرتکب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔ حضرت صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہے اور عذاب کے بعد مدین کے علاقے سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کی جانب ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ لہذا کوہ طور کے علاقہ میں حضرت صالح علیہ السلام کا

مزار جو ہے اس میں تاریخی شواہد اور صداقت موجود ہے۔ مصنف نے اللہ کے نبی کے مزار کی خستہ حالی پر دکھ کا اظہار بھی کیا اور ہمارے ملک میں موجود مزارات سے موازنہ بھی کیا کہ ہمارے ملک میں مزارات کی تعمیر اور زیبائش کا ذکر کیا۔ یہ ایک نبی اللہ کا مزار ہے جب کہ ہمارے ملک میں مزارات پر لاکھوں روپے کے نذرانے دیئے جاتے ہیں اور سنگِ مرمر سے مرصع کیے جاتے ہیں۔ بلکہ مساجد بھی خوب صورت اور شاندار تعمیر کی جاتی ہیں نیز ایک نبی کا مزار خستہ حالی کا شکار ہے۔

مصنف نے کوہ طور کو دیکھنے کے لیے ساتھیوں کے ساتھ رختِ سفر باندھا۔ نیز حضرت صالح علیہ السلام کے مقام سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر میدان الراحد کا مقام ہے یہ وہی مقام ہے جہاں بنی اسرائیل نے ہجرت کر کے پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس مقام کے متعلق سفر نامہ نگار یعقوب نظامی نے یوں منظر کشی پیش کی ہے۔

> جہاں میں کھڑا تھا میرے سامنے سینٹ کیتھرائن کی خانقا تھی۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام تھا یہ وہی جگہ تھی جہاں حضرت موسیٰ نے کوہ طور سے واپسی پر حضرت ہارون کا مواخذہ کیا تھا۔ میرے بائیں طرف کوہ طور پہاڑ تھا۔ بھورے پہاڑ جس میں پتھر ہی پتھر تھے۔ سبزہ نام کی کوئی چیز نہیں نظر آ رہی تھی۔ ایک تنگ گھاٹی تھی جس کے دونوں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ اس گھاٹی اور ان پہاڑوں کے درمیان ہی اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوئے اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو نبوت عطا کی تھی یہی وادی مقدس طویٰ کہلاتی ہے۔[۱۶]

کوہ طور کا تذکرہ ہماری شاعری میں بھی ملتا ہے اور بچپن سے یہ بات سنتے آتے ہیں کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اس لیے اس مقام کی فضیلت اور اہمیت ہمارے ذہنوں میں رچی بسی ہوئی ہے اور پھر مصنف نے اس کی جو منظر کشی کی ہے وہ حقیقت پر محیط ہے۔ جبکہ تاریخی روایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے باشندے تھے اور وہاں پر ان کے ہاتھوں ایک شخص کا قتل ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ وہاں سے نکل کر مدین آئے۔ دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دس سال تک حضرت شعیب کی بکریاں چرائیں گے تو اس کے ذریعے حضرت موسیٰ کی شادی حضرت شعیب کی بیٹی سے ہو سکتی ہے۔

یہ قدرت کا کرشمہ ہے کہ ایک نبی کی تربیت دوسرے نبی کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ لہذا حضرت موسیٰ دس سال تک وہاں پر حضرت شعیب کی بکریاں اور بھیڑ چراتے رہے اور دس سال کی خدمت کے بعد حضرت

موسیٰ کی شادی حضرت شعیب کی لڑکی حضرت صفورہ سے ہوئی اور شادی کے بعد حضرت موسیٰ نے واپس مصر جانے کا ارادہ کیا تاکہ اپنے عزیز و اقارب اور اپنی قوم کے حالات معلوم کر سکیں اور دورانِ سفر حضرت موسیٰ راستہ بھٹک کر کوہ طور پہاڑ کی طرف نکل آئے تھے اور اس مقام پر انھیں رات ہو گئی تھی۔ اندھیری رات، سردی اور بیاباں میں انھیں کہیں سے آگ کی ایک چنگاری نظر آئی جو پہاڑ کے دامن میں تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم یہاں میرا انتظار کرو میں وہاں سے آگ لے کر آتا ہوں اور پہاڑ کے دامن میں ہی غیب کی آواز آئی تھی کہ موسیٰ جوتے اتارو تم وادی طویٰ پر پہنچ چکے ہو اس مقام پر حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے جس کو کوہ طور کہتے ہیں اور چنگاری والی جگہ پر ننگ بش یعنی روشن جھاڑی کے نام سے مشہور ہے۔ اس چنگاری والے مقام پر سینٹ کیتھرائن نے اپنی زندگی بسر کی۔ لہذا ۵۲۷ میں قسطنطین کے زمانے میں جیٹینیا نے چرچ کی عمارت تعمیر کرائی جہاں حضرت موسیٰ کی چنگاری نظر آئی تھی نیز مصنف مزید لکھتے ہیں کہ:

> سینٹ کیتھرائن کے سامنے ایک اونچی پہاڑی ہے ہم اس پر چڑھ کر دور دور تک دیکھنے لگے۔ جس چھوٹی پہاڑی پر ہم کھڑے تھے وہاں سے دائیں طرف چند فرلانگ کے خاتمے پر ایک پہاڑی ٹیلے پر حضرت ہارون علیہ السلام کا مزار اور اس کے ساتھ پہاڑوں کے درمیان ہموار میدان جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو چھوڑ کر کوہ طور پر تشریف لے گئے تھے ہمارے بائیں طرف کوہ طور کا پہاڑ تھا۔[۱۷]

مصنف نے جس عقیدت و احترام سے کوہ طور، مقدس طویٰ کا نقشہ پیش کیا ہے وہ حقیقت میں جذبہ ایمانی کا متقاضی ہے جو حرف بہ حرف عقیدت و احترام سے سرشار ہے۔ اس مقام پر مصنف کے ساتھیوں نے یادگاری تصویریں بنائیں اور پھر مشترکہ فیصلہ کیا کہ پہلے کوہ طور پر اور پھر حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار پر حاضری دیں گے۔ لہذا وہ اس چھوٹی پہاڑی سے اتر کر سینٹ کیتھرائن واپس آئے اور یہاں سے ایک پولیس والا بھی رہنمائی کے لیے ہمراہ کیا تاکہ دورانِ سفر راستہ نہ بھول جائیں۔ چنانچہ سینٹ کیتھرائن سے آگے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے جدھر جانے کے لیے پیدل اونٹوں پر سفر کیا جاتا ہے۔ لیکن مصنف کے دوستوں نے اونٹوں کے بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دی حالانکہ راستہ کشادہ تھا جس پر اونٹ باآسانی چل سکتے تھے اور اونٹوں کے قافلے جا بھی رہے تھے اور ارد گرد پتھر ہی پتھر تھے۔ مصنف یوں رقم طراز ہیں:

> پولیس آفیسر نے بتایا کہ سامنے جس پہاڑ کے پتھر ریزہ ریزہ ہو کر نیچے آئے وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ نے حضرت موسیٰ کے اصرار پر اپنی تجلی دکھائی تھی۔[۱۸]

نیز پتھر اب بھی بکھرے ہوئے ہیں جو قدرت کا کرشمہ یا معجزہ ہے کہ اپنے نبی کے اصرار پر تجلی دکھاتے ہیں جس کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ نیز قرآن مجید میں اس واقعے کا تفصیل سے ذکر سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ کی بات چیت دوستوں کی طرح ہوتی تھی۔ شاید اسی لیے حضرت موسیٰ کو کلیم اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب ہموار راستے کی جگہ دشوار راستہ شروع ہو جاتا ہے جس پر چڑھنا انتہائی مشکل ہے۔

سفر نامہ نگار نے چوٹی پر چڑھتے ہوئے خوف کا اظہار بھی کیا ہے اور دل میں اس مقام کو دیکھنے کا اشتیاق بھی موجزن تھا کہ اس مقام کو دیکھا جائے جہاں کلم اللہ اپنے رب سے گفتگو کرتے تھے۔ جب انہیں راستے میں دشواری ہوئی تب انھوں نے دعا بھی مانگی۔ اس دعا میں جو سوز و گداز، اضطراب، بے چینی اور قلبی حالت بیان کی گئی ہے وہ بھی ابھی ادبی حیثیت رکھتی ہے۔ دعا کہ الفاظ یہ ہیں کہ "اے اللہ میں حضرت موسیٰ کا طرفدار ہوں، فرعون نہیں زندگی میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا مقابلہ ہوتا رہا، آخری بازی حضرت موسیٰ نے جیتی تھی، میں فراعنہ کے مقبرے میں عبرت حاصل کرنے گیا تھا۔ اسی کی پیروی کرنے نہیں، اگر میں نے غلطی کی تو مجھے معاف کر اور مجھے وہ طاقت دے جس کے سہارے میں جبل موسیٰ پر پہنچ سکوں۔"

اس دعا کی مدد سے مصنف اپنی قوت بحال کرتے رہے اور اس مقام پر پہنچ گئے جس کے لیے وہ صبح سے سفر کر رہے تھے۔ کوہ طور کی چوٹی پر سب سے پہلے مصنف نے قدم رکھا اور دیگر دوست ایک ایک کر کے اس چوٹی کو سر کرتے رہے۔ حالانکہ یہ صرف پہاڑ کی چوٹی تھی لیکن اہل ایمان والوں کے لیے روح پرور منظر تھا۔ قدرت کی نشانیاں تھیں جسے دیکھ کر ایمان کا مرکزہ تر و تازہ ہوتا ہے۔ مصنف کے دوستوں نے نوافل ادا کیے اور دعائیں مانگیں کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ یہ منظر زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا جو تمہاری وحدانیت کی نشانیاں ہیں۔ انہی نشانیوں پر اب کھڑے قدرت کا معجزہ دیکھ رہے ہیں جو باعثِ رشک ہے اور ایمان کو پختہ کرنے کے مترادف ہیں۔

> پہاڑ کی چوٹی پر ایک گرجا گھر ہے جو بند تھا، یہ گرجا ایک سفید کمرے پر مشتمل ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر نیچے دیکھیں تو دامن میں سینٹ کیتھرائن کی عمارت نظر آتی ہے۔ اس سے تھوڑا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا مزار اور آگے پہاڑوں کے درمیان ایک کھلا میدان۔[۱۹]

یہاں مصنف نے دوستوں کے ہمراہ ایک گھنٹہ صرف کیا، نوافل ادا کیے اور پھر چوٹی پر کھڑے ہو کر چاروں جانب قدرتی مناظر کا مشاہدہ کیا۔ تصویریں بنوائی اور اس پل کو تصویر میں قید کر لیا۔ کھلے میدان کے لیے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالباً اسی مقام پر حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں کو حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر کے خود کوہ طور پر گئے ہوں گے اور چالیس دن کا قیام کرنے کے بعد واپس آئے ہوں گے۔ جہاں چالیس شب و روز کی عبادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے اپنے دس احکامات پتھر کی سیلوں پر لکھ کر بھیجے تھے۔ جو Ten Commandments یا احکام عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ تاہم مصنف اپنے دوستوں کے ہمراہ جس راستے سے چوٹی پر گئے تھے اسی سے واپس اترتے بھی ہیں۔ پہاڑ پر چڑھنا مشکل اور اترنا اس سے بھی مشکل عمل ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس دن کی عبادت پر گئے تھے تب ایک جادو گر نے بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لیے سامری کا بچھڑا بنایا تھا جس سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل نے اس کی پوجا شروع کر دی تھی اور جب حضرت موسیٰ واپس آئے تب انھوں نے حضرت ہارون کا محاسبہ بھی کیا تھا جس کا مکمل تذکرہ کلامِ الٰہی میں موجود ہے۔ لہذا اس کو یوں قلمبند کیا ہے کہ :

> ہم نے کوہ طور کے دامن میں ایک چٹان پر بچھڑے کے نقوش دیکھے جو بالکل نمایاں نظر آ رہے تھے جو اس بات کے گواہ تھے کہ سامری کا معاملہ یہاں ہی پیش آیا تھا اس کے قریب پشت کی طرف ایک اونچے ٹیلے پر حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام ہے۔[۲۰]

سفر نامہ نگار نے بڑی باریک بینی سے سفر کے تمام معاملات کو رقم کیا ہے اور کہیں پر بھی تاریخی مقامات کو نظر انداز یا فراموش نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے اور اسلوب بھی دردمندانہ، عاجزانہ اور عالمانہ استعمال کیا ہے۔ جہاں عقیدت کی ضرورت تھی وہاں پر پر سوز پیرائے سے دل کی کیفیت اور حالت بیان کی ہے نیز بنی اسرائیل نے ایک خاص موقعے پر وحدانیت سے بت پرستی کی جانب مراجعت کی۔ اس پورے واقعے کی روداد بھی سفر نامہ نگار کے بجائے مؤرخ اور مبلغ کی حیثیت سے قلمبند کیا ہے۔ چنانچہ ان کا سفر نامہ صرف مقامات اور فراعنہ کے مزارات کی کہانی نہیں ہے بلکہ تاریخ، تہذیب اور سیاحت کے لوازمات بھی شامل ہیں۔ جس انداز سے انھوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار کو دیکھنے کے بعد اپنے جذبات کو بیان کیا ہے وہ انتہائی دلخراش اور پر سوز کیفیت سے معمور ہے۔ لہذا مصنف کے اپنے دوستوں کے ہمراہ میدان

الراحد کو دیکھا، بچھڑے کے نقوش بھی دیکھے اور پھر حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار کو دیکھنے کا ارادہ کیا اور اس طرف نکل پڑے:

> ہم حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار پر حاضر ہوئے، یہ ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ مزار کا دروازہ بند تھا۔ یعقوب آزاد نے دروازہ کھولا اور ہم اندر چلے گئے۔ کمرے کے عین درمیان ایک قبر تھی جو زمین سے تین فٹ اونچی تھی جس پر سبز چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ فرش اور دیوار کچے تھے کسی اللہ کے بندے نے سفید رنگ کر رکھا تھا۔[۲۱]

مصنف نے حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار کو دیکھ کر جس دکھ سے اظہار کیا ہے وہ عقیدت واحترام اور ایمان کا حصہ ہے، نیز ان کے ساتھی یعقوب آزاد دھاڑیں مار مار کر رونے لگے کہ ایک پیغمبر کا مزار خستہ حالی کا شکار ہے جبکہ مشرقِ وسطیٰ دنیا کے امیر تری ممالک میں سے ایک ہے پھر بھی اپنے انبیاء کی باقیات اور نشانات کے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا ہے۔ نیز فراعنہ کے مزارات کی رنگینی اور رونق چہ معنیٰ دارد۔ لہذا مصنف اپنے دوستوں کے ہمراہ کچھ دیر وہاں رہتے ہیں پھر بوجھل قدموں اور دکھی دل کے ساتھ وہاں سے نئی منزل کی جانب رختِ سفر باندھتے ہیں۔ تاہم مصنف نے جو جملے لکھے ہیں وہ لمحہ فکریہ اور صداقت پر مشتمل ہیں۔ اب انھوں نے نخلستان فاران کی جانب سفر شروع کیا اور ستر کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہاں پہنچے جس کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں:

> یہ نخلستان تقریباً تین میل لمبا ہوگا۔ چوڑائی تھوڑی ہے اور ارد گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یہاں بجلی اور ضروریات زندگی کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ آبادی سڑک سے دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر تھی لیکن اس کے باوجود سڑک پر روشنی کے لیے بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ تخلستان فاران میں کثرت سے پانی اور باغات دیکھے۔ کھجور، انگور اور زیتون کے درختوں نے صحرا میں نخلستان کو جنم دے کر لوگوں کو ایک نئی زندگی دے رکھی تھی۔ عیسائی اس نخلستان کو رفیدیم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔[۲۲]

رفیدیم وہ مقام یا جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا کو ایک چٹان پر مارا تھا اور وہاں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔ یہ تاریخ کی کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک قوم کے لیے الگ الگ قبائل کے لیے بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے قبائل میں شدید اختلافات تھے اور آج ایسے

ہی اختلافات مسلمانوں میں جنم لے چکے ہیں۔ان اختلافات کی وجہ سے ہماری طاقت اور قوت جاتی رہی، جس کا فائدہ پر مخالف اٹھا رہا ہے۔ نیز مصنف نے اس امر کی نشاندہی کرنے کے بعد وادی فاران کی جانب سفر کیا اور وادی فاران کا نقشہ کچھ یوں پیش کیا:

> وادی فاران نخلستان فاران سے بحرہ احمر تک پھیلی ہوئی ہے، وادی فاران ریگستان اور صحرا پر مشتمل ایسا علاقہ ہے جہاں دور دور تک ہریالی نام کی کوئی چیز نہیں۔ بعض جگہوں پر بدوؤں کے خیمے دیکھے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہاں لوگ رہتے بھی ہیں۔[۲۳]

ہر چند کہ ہر طرف سے خشک سالی تھی اور یہ مصنف کا آخری مسکن تھا۔اس کے بعد واپس قاہرہ آئے اور پھر انگلستان روانگی کا انتظام کرنے لگے چونکہ مصر انبیاء کی سرزمین ہے اس لیے وہاں حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے نشانات، مقامات ملتے ہیں جس کے ایمان کی تازگی اور جذبہ توحید کو تقویت ملتی ہے۔ نیز دیگر اسلامی عہد کی مساجد اور یادگار عمارتیں بھی موجود ہیں جس میں قلعہ ایوبی، مسجد حسین علیہ السلام قابل ذکر ہیں اور جو بھی سیاحت کی غرض سے مصر جاتا ہے وہ ان مقامات کو لازمی دیکھتا ہے نیز رفیق ڈوگر کے سفر نامے میں ان مقامات کا ذکر نہیں ملتا۔ کیونکہ بعض سیاح کے مقامات اور شہر بھی متعین ہوتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا سفر نامہ بھی تشنہ ہے اور سعید جاوید نے بھی ان مقامات کا تذکرہ اور مشاہدہ اتنی گہرائی و گیرائی سے بیان نہیں کیا۔ شاید سفری پابندی یا دیگر وجوہات کی بنا پر خاص مقامات اور شہر تک ان کی رسائی ہو سکی ہے۔ نیز یعقوب نظامی نے مصر کے تاریخی مقامات کی سیاحت بھی کی اور تفصیلاً مشاہدہ بھی پیش کیا ہے اور جگہ جگہ پر علمی و ادبی نکات کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ ان کا سفر نامہ صرف سیاحت تک محدود نہیں ہے بلکہ تاریخ و تہذیب، سیاست اور اقتصادیات کے پہلوؤں کو بھی بیان کرنے کی سعی کرتے ہیں جس کا اسلوب ایک دردمند دل کی عکاسی کرتا ہے۔ کہیں کہیں ظرافت اور طنز کے جملے بھی ملتے ہیں۔ بالخصوص حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار کو دیکھنے کے بعد ان کی عبارت دکھی دل کی صدا معلوم ہوتی ہے جو درد میں ڈوبی ہوئی ہے اور عقیدت کے احساس سے سرشار ہیں۔

فراعنہ کے عقائد:

فراعنہ کے عقائد تاریخی تناظر اور ارتقا سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا عہد قبلِ مسیح کا تھا اور اس زمانے میں وحدانیت کا چرچا نہیں تھا، اگرچہ انبیاء کرام نے انھیں صراط مستقیم کی تبلیغ بھی کی تو انھوں نے حسبِ معمولِ اس

سے انکار کیا کہ اپنے اجداد کے عقائد کو خیر آباد کہنا توہین ہو گئی۔ جس کی مثال فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جنگ ہے۔ چنانچہ ان کے عقائد ان کے ماحول اور جغرافیائی حالات سے پیدا ہوئے۔ ان کے زندہ رہنے اور معاشی خوشحالی کا اصل دریائے نیل سے جڑی ہوئی تھی اس لیے اس دریا سے ان لوگوں کی عقیدت مندی پیدا ہو گئی اور اس دریا کو دیوتا کا درجہ دینے لگے نیز دریا کے دیوتا کو اوسیرس کہتے تھے اور فصل کے لیے انھوں نے سورج کے کرشمات اور برکتوں کو دیکھا اور محسوس کیا۔ لہذا اس کی بھی پوجا کرنے لگے اور سورج دیوتا کا نام "را" تھا۔ دراصل دیوتاؤں کے پوجاری تھے۔ جس کی عبادت بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ کی جاتی تھی۔

یہاں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور روح دوبارہ جسم میں داخل ہو گی۔ اس کے جسم کو محفوظ رکھنا لازمی ہے۔ اس لیے حنوط کر کے مردہ جسم کو مختلف مصالحوں کے ساتھ محفوظ کر دیتے تھے اور اس کے ساتھ کھانے پینے کی اشیا، ہیرے و جواہرات بھی رکھے جاتے تھے کہ روح کو جب اس کی ضرورت پڑے گی وہ اس کو استعمال کرے گی۔

ان لوگوں کا ہندوؤں کی طرح آواگون پر یقین تھا کہ اچھے روح جانوروں میں منتقل کیے جائیں گے اور یہ تب ہو گا جب جزا و سزا کا معاملہ طے پائے گا۔ اس لیے چالیس کبیرہ گناہوں کی سزا دی جائے گی اور کوڑے برسائے جائیں گے جس سے روح پاک ہو جائے گا اور روح پاک ہونے کے بعد دیوتا کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ لہذا ان کے عقائد عجیب و غریب خیالات و تصورات پر مبنی تھے۔ اس حوالے سے یعقوب نظامی یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ایک کہانی کے مطابق زمین و آسمان کے ملاپ سے ان کا دیوتا ازریس وجود میں آیا تھا جس کا جسم انسانی اور سر جانور کا تھا۔ یہ تمام دیوتاؤں کی صفات کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔ فراعنہ کے عقیدے کے مطابق اسی ازریس دیوتا نے یہ دنیا اور لوگ بنائے۔ اس کا بھائی ساتت تھا جو بڑا مغرور اور بد کردار دیوتا تھا۔ ان کی ایک بہن ازیس نامی تھی جو بہت خوب صورت تھی۔ ازریس دیوتا نے اپنی بہن سے شادی کر لی تھی جو ساتت کو برداشت نہیں ہوا اور اس نے اپنے بھائی ازریس کو قتل کر کے اس کے چودہ ٹکڑے کر کے کسی خفیہ مقام پر چھپا دیا تھا۔ (۲۴)

یہ ایک ایسی ہی کہانی ہے جس کے کردار یونانی اساطیر میں بھی ملتے ہیں اور ہندو مذاہب میں بھی ملتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں حضرت آدم علیہ السلام اور اس کی پسلی سے پیدا ہونے والی بی بی ہوا پر مشتمل ہے اور یہاں

بھی ہابیل اور قابیل کا قصہ ملتا ہے۔ جو بہن کی وجہ سے لڑے ہیں اور ہابیل نے قابیل کو قتل کر دیا۔ لیکن اسلامی تعلیمات میں دفن کرنے کا نظریہ ملتا ہے اور سب سے اہم بات کہ خدا کی وحدانیت اور توحید کا نظریہ بھی ملتا ہے جبکہ مصری اساطیری دیوتاؤں سے وحدانیت کا فقدان ہے۔ ہر چند کہ یہ عہد دیوتاؤں اور اساطیری قصوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ ابتدائی سماج کے ارتقا کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی روایتیں کردار کے فرق سے ملتی جلتی ہوئی ملتی ہیں۔ ہندو مذہب میں رام، کرشن، ہنومان کا تصور بھی ابتدائی زرعی سماج کی دین ہیں۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر الطاف یوسف زئی یوں لکھتے ہیں:

> فرعون ادوار میں جانور دیوتا زیادہ مقبول تھے مصریوں کی عبادت خانے، سانڈ، مگرمچھ، باڑہ گائے، ہنس، بکرے، بلی، مینڈھے، کتے، مرغی، ابابیل، گیدڑ، سانپ کی نسلوں سے بھرے پڑے ہیں۔[۲۵]

اگر ہم ان عقائد کا تجزیہ کریں تو یہ عقائد برصغیر کے ہندو مذہب سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ہندو مذہب میں گائے کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور سانپ سے پوری روایت ملتی ہے کہ اس کے علاوہ دیگر جانوروں سے بھی عقیدت ملتی ہے۔

مصری لوگوں کا عقیدہ تھا کہ کوئی بھی جسم یا انسانی وجود چار اجزا کا مرکب ہے۔ نور، خاک، روح اور دیوتا کے سر سے نکلی ہوئی کرنِ حیات سے زندگی جنم لیتی ہے اور ان کا آخرت پر بھی یقین تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور نیک لوگوں کی روحیں کلنگ، گھڑیال اور لومڑیاں وغیرہ کی مورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔

فراعنہ کے عقائد عجیب و غریب اور حیرت انگیز تھے، ان کے یہاں بیج کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی کیونکہ وہ زیرِ زمین خود کو فنا کر کے تخلیق کا عمل بنتی تھی۔ نیز اس لیے ازریس دیوی کو مادرِ تخلیق سے موسوم کیا جاتا تھا کہ اس نے بھی اپنے شوہر دیوتا ازریس کو ڈھونڈ کر دوبارہ زندہ کیا تھا اور یہی دیوتا گناہوں کا حساب کتاب بھی کرتا تھا۔

مصری عقائد کے مطابق، مردہ لاش کے ساتھ اچھے اور برے کاموں کی تختی لگائی جاتی تھی جس پر اس کے سارے کارنامے درج ہوتے تھے اور ہر فرعون نے اپنے لیے الگ دیوتا کی پوجا کو رائج کیا ہوا تھا اور پھر اس کے ساتھ بادشاہ بھی دیوتا کا روپ اختیار کر سکتا تھا لیکن اس کی تین شرائط ہوتی تھیں:

اول اپنے لیے اہرام، دوسرا شہر میں اعلیٰ شان مندر تعمیر کروائے اور تیسرا کسی دشمن کو عبرت ناک شکست دے جو بادشاہ یہ تینوں کام حیات میں انجام دے کر رخصت ہوتے رہے وہ دیوتا کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔(۲۶)

یعنی بادشاہ بن جاتا تھا اور اس کی عبادت کی جاتی تھی اور فراعنہ کے بادشاہوں کی روایت تھی کہ وہ دیوتا حورس کو زندہ تصور کرتے تھے۔ دیوتا حورس کا سر عقاب کا تھا اور بادشاہ اپنے تاج میں عقاب کی آنکھ لگاتے تھے جو دیوتا حورس کی نشانی تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ آنکھ بادشاہ کو دشمنوں سے بچاتی ہے۔ اس طرح ان گنت دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ اس عہد کے عقائد درحقیقت وحشی عہد کی غمازی کرتے ہیں اور زرعی عہد میں داخل ہونے کی بھی۔ لہذا فراعنہ کے عقائد وقت، حالات اور جغرافیائی ماحول پر پروان چڑھے اور پھر ختم بھی ہو گئے۔

تاریخی مزارات:

مصر اور اس کے گرد و نواح میں کئی انقلابات آئے اور وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ فراعنہ خاندان کی حکمرانی، رومیوں کی آمد، یونانیوں کی یورش اور آخر میں اسلام کا مرکز بننا یہ ایک تاریخی عمل تھا۔ جو صدیوں پر مشتمل ہے۔ مختلف رنگ و نسل کے لوگ یہاں مختلف مذاہب اور نظریات لائے۔ یہاں رہے اور اسی مٹی کا حصہ بن گئے۔ کسی کے یہاں مزارات ملتے ہیں اور بعض کے مقامات اور جائے پیدائش کے مقام ملتے ہیں۔ اسی طرح یہاں تاریخی مقامات اور مزارات کا ایک سلسلہ اور تانا بانا بندھ سا گیا ہے جو ہنوز جاری ہے۔

سیاح جب بھی سیاحت کی نیت سے کہیں جاتا ہے تب وہ سب سے پہلے تاریخی مقامات اور مزارات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتا ہے۔ نیز ہم پہلے اہلِ اسلام کے مزارات کو ترجیح دیں گے جن کی کاوشوں سے مصر میں اسلام پھیلا اس حوالے سے یعقوب نظامی نے مزارات کے متعلق اپنی رائے بھی دی ہے۔ وہ جب مصر سیاحت کی غرض سے گئے تب انھوں نے پہلے امام شافعی کے مزار کی زیارت کی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ:

قاہرہ کی سیاحت کا آغاز ہم نے قدیم شہر میں واقع حضرت امام شافعی کے مزار سے کیا یہ مزار قدیم شہر میں دار لسلام کے علاقہ میں ہے۔(۲۷)

یہ علاقہ تنگ گلیوں پر مشتمل تھا۔ محلے کے تمام مکانات خستہ اور مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اگر اس علاقے کا موزانہ پاکستان کے دیہات سے کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یعقوب نظامی نے امام شافعی کے مزار کی منظر کشی یوں پیش کی ہے:

ہماری گاڑی گلیوں سے گزرتی ہوئی آخر دائیں ہاتھ مڑ کر محلہ شافعی کی جامع مسجد کے سامنے رک گئی یہ مسجد امام شافعی تھی، جس کے اندر امام صاحب ابدی آرام فرما رہے ہیں۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی اور مزار کے اندرونی حصہ کا جائزہ لیا تو یہ ایک پرانی، بوسیدہ اور اپنے دور کی بے مثال اور باوقار عمارت تھی، بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی مرمت اور تزئین کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی، امام شافعیؒ کی قبر عرب کی روایتی قبروں کی طرح زمین سے کوئی پانچ فٹ اونچی تھی جس پر سبز چادریں بچھی تھیں۔ فرش پر قدرے پرانا قالین تھا۔ فرش اور مزار پر دھول نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ (۲۸)

حضرت امام شافعی یہاں درس وتدریس کی غرض سے آئے تھے اور پھر یہیں ان کی وفات ہوئی۔ امام شافعی کی مشہور تصنیف کا نام رسالہ ہے جو انتہائی مستند کتاب ہے۔ چنانچہ جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر فتح کیا تو انھوں نے امام شافعی کی تعلیمات پر سختی سے عمل کروایا اور جامع الازہر کے سربراہ کے لیے لازمی قرار دیا کہ ان کا تعلق امام شافعی کے مسلک سے ہو۔ نیز ابھی بھی جامع الازہر کے امام کا مسلک شافعی ہے۔

مصنف نے اس بستی یا علاقے کی عجیب منظر کشی پیش کی ہے کہ یہاں کے لوگ قبر نما گھروں میں رہتے ہیں یعنی گھروں کے تہہ خانوں میں اپنے عزیز واقارب میں سے کسی کی موت واقع ہو جائے تو انھیں صحن یا تہہ خانوں میں دفن کرتے ہیں۔ یہ بات مصنف کے لیے باعثِ حیرانگی بنی اور انھوں نے وہ تہہ خانے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے۔ جسے انھوں نے حیرت کدہ سے موسوم کیا۔ امام شافعی کے مزار کے ساتھ امام ولیعہ اور امام ابو اللیث ثمر قندی کا مزار بھی ہے۔ چنانچہ سفر نامہ نگار یہاں نوافل، دعائیں اور تصاویر کے لوازمات سے فارغ ہو کر ملوک کے مزارت کو دیکھنے گئے۔

یہ مصر کے مسلمان بادشاہوں کے مزارت تھے، بڑے بڑے کمروں میں اونچی اونچی قبروں پر بڑے کتبے نصب تھے جس پر ان فلوک کی تفاصیل لکھی ہوئی تھیں اس میں ایک ہی خاندان کے تمام حکمرانوں اور ان کی بیگمات کی اجتماعی قبریں تھیں یہ پاشا حکمرانوں کے مزار تھے، یہاں تمام مزارات محمد علی پاشا اور اس کے جانشینوں کے تھے۔ یہاں اسماعیل پاشا کی قبر تھی جس نے مصر کے شہر اسماعیلیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ ابراہیم پاشا اور مصطفیٰ پاشا بھی یہاں آرام فرما رہے تھے۔ ان مزارات کے ساتھ ایک بڑے ہال میں چوبیس قبریں تھیں۔ (۲۹)

مصر میں پاشا خاندان نے بھی حکمرانی کی تھی جس کے جد امجد محمد علی پاشا تھے جو اصل میں البینیا کے رہنے والے تھے اور برطانوی فوج میں افسر تھے۔ انھیں جب مصر تعینات کیا گیا انھوں نے ساز باز کی اور برطانوی سرکار کے عزایم کو عملی جامع پہنایا۔ خود کو بادشاہ قرار دے کر مصر کو سلطنت عثمانیہ سے الگ کر دیا۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ کنگ فاروقی تھے جن کی حکومت یا بادشاہت جمال عبدالناصر نے ختم کی تھی اور ہال میں موجود چوبیس قبریں ان لوگوں کی تھیں جنھوں نے محمد علی پاشا کی خلافت عثمانیہ سے الگ ہونے کی مخالفت کی تھی۔ نیز حاکم وقت نے ان چوبیس افراد کو قتل بھی عجیب و غریب اور دھوکہ دیہی سے کیا۔ محمد علی پاشا نے ان لوگوں کو دوستی کا پیغام بھیج کر قاہرہ کے قلعہ میں کھانے کی دعوت دی۔ تاہم ان چوبیس لوگوں نے دوستی کا پیغام قبول کیا اور دعوت پر آئے۔ پاشا نے دعوت کھلائی اور یہ لوگ واپس جانے لگے تو قلعہ کے مین دروازے پر سب کو قتل کروادیا اور یہ چوبیس قبریں انہی معززین کی ہیں تخت وطاؤس کی کہانی خون، جنگ اور دھوکہ دہی سے عبارت ہے۔

قاہرہ میں دارالسلام کے علاقہ میں محلہ زینبیہ بھی ہے۔ جہاں مقامی لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ محلہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ہمشیرہ حضرت زینب اور صاحبزادی نفیسہ مدفون ہیں۔ سفر نامہ نگار لکھتے ہیں:

> ہم نے گاڑی پارک کی اور مزار کے اندر چلے گئے۔ مزار پر اہلِ تشیع حضرات کی کثرت تھی۔ میں نے مزار پر حاضری دی لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ اہلِ بیت یہاں تک آئے مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے جب میں شام کے دار لحکومت دمشق گیا تو وہاں قریب ہی زینبیہ کے علاقے میں حضرت زینب کے مزار پر حاضری دی تھی، تاریخی لحاظ سے مجھے شام والا مزار حقیقی نظر آتا ہے۔ (۳۰)

تاریخی طور پر کتنی صداقت ہے کہ مصر میں حضرت زنیب اور اس کی صاحبزادی کا مزار ہے یہ مؤرخین کا کام ہے لیکن سفر نامہ نگار نے جو اپنی طرف سے سمجھا، اس کا اظہار کیا اور اہم بات کہ تصدیق اور تحقیق کے بغیر مزار کو اہل بیت کے ساتھ منسوب کیا جارہا ہے۔ تاریخی طور پر اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح مصر میں حضرت حسین کا مزار بھی دیکھنے کو ملتا ہے جہاں حضرت حسین علیہ السلام کا سر مبارک مدفون ہے۔ جو جامع الازہر کے ساتھ ہے۔ اس کی روداد انھوں نے یوں رقم کی ہے:

ہم اس شاہراہ کو عبور کر کے مسجد حسین علیہ السلام کی طرف چل پڑے۔ مقامی روایات کے مطابق ۱۱۵۳ع میں حضرت امام علیہ السلام کا سر مبارک یہاں دفن کیا گیا۔البتہ مزار کے اوپر ایک انتہائی خوب صورت مسجد ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔[۳۱]

سفر نامہ نگار نے یہ بات رقم تو کر دی ہے لیکن اس کا مطالعہ اور مشاہدہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہاں پر حضرت حسین علیہ السلام کا سر مبارک دفن ہو گا۔ جبکہ کربلا کا واقعہ ۱۶۸۲ع میں پیش آیا اور مدفن ۱۱۵۳ع میں کیا گیا۔ کم و بیش ۴۷۱ سال کے بعد قاہرہ میں کیسے دفن کیا گیا جو روایات اور تاریخی شواہد کے منافی ہے اور دمشق میں بھی ایک مزار ہے جہاں حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک کا مزار ملتا ہے جو دمشق کی جامع مسجد میں ہے۔ لہذا تاریخی حوالہ جات مصری لوگوں کی روایت کو مسترد کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن لوگ بڑے احترام سے دعائیں مانگتے ہیں۔

نیز اس مسجد اور حضرت حسین علیہ السلام کے سر مبارک کے حوالے سے ڈاکٹر محسن نے بھی لکھا ہے اور انھوں نے بلال زبیر کی کتاب فاران سے کربلا تک سے اقتباسات نقل کیے ہیں اور ان اقتباسات کی مدد سے دلائل دیئے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک یہیں پر دفن ہے اور اس جگہ کو مقام حسین علیہ السلام کہتے ہیں۔ جس کا پہلا مزار سلیمان بن عبدالمالک کے عہد میں تعمیر کر روایا گیا جو گردشِ زمانہ کے ہاتھوں شکستہ ہو گیا تھا پھر ہر امیکوں نے اپنے عہد میں تعمیر کروایا۔ لہذا یہ منقش عمارت فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ ڈاکٹر محسن مگھیانا دلائل دینے کے بعد اپنے سفر نامے "حسن مصر" میں لکھتے ہیں:

ہم نے اس زری کی زیارت بھی کی اور عقیدت سے چوما جہاں یہ روایت کے مطابق حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک موجود تھا۔ ہم سب پہ کربلا پر ہونے والے اہل بیت اور ان کے ساتھیوں پر ہونے والے ظلم کا سوچ کر ہی رقت طاری ہو گئی اور ہم بھیگی پلکوں سے وہاں سے واپس لوٹے۔[۳۲]

مصر میں ایک مسجد اور اس کے ساتھ مزار کو حضرت حسین علیہ السلام کے سر مبارک سے منسوب کرنا، خالصتاً تاریخی موضوع ہے۔ اس پر تحقیق اور رائے بھی مؤرخین دے سکتے ہیں۔ نیز سفر نامہ نگار نے محض عقیدت و احترام کو پیش کیا ہے جو دراصل جذبہ ایمانی سے سرشار ہے کیونکہ واقعہ کربلا انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ اور المیہ ہے۔ تمام سفر نامہ نگاروں نے قاہرہ میں حضرت حسین علیہ السلام کے سر مبارک کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں رفیق ڈوگر اپنے سفر نامے "اور نیل بہتا رہا" میں یوں رقم طراز ہیں:

ایک طرف زائرین کا ہجوم تھا ہم آگے گئے تو سنہری جالیوں سے لگے لوگ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ عبدالجبار نے بتایا کہ یہاں امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک دفن ہے اسی لیے مسجد کا نام مسجد حسین علیہ السلام ہے ایک تاریخی روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مصر لے آئی تھیں۔ (۳۳)

دراصل حیران کن پہلو مسجدِ امام حسین نہیں ہے بلکہ حضرت حسین علیہ السلام کے سر مبارک کی روایت ہے۔ الغرض لوگوں کی عقیدت اور نیاز مندی قابلِ دید اور قابلِ تحسین ہے۔ سفر نامہ نگار نے یہاں دوستوں کے ہمراہ نماز ادا کی جو اہلِ سنت کے طریقے سے پڑھی گئی اور نمازیوں نے بھی اسی طریقے سے نماز ادا کی۔ نیز ڈوگر نے وہاں پر حضرت سکینہؑ اور حضرت نفیسہ کے مزار کا ذکر کیا ہے اور وہ اس طرح لکھا ہے:

سیدہ زینب کے مزار کے باہر نیاز اور خیرات کے امیدوار صفیں باندھے بیٹھے تھے، فٹ پاتھوں پر مصری خواتین بال بچوں سمیت سودا سلف بیچ رہی تھیں۔ سیدہ نفیسہ اور سیدہ سکینہ کے مزاروں کے ملحقہ مساجد بھی خوب صورت قالینوں سے آراستہ تھیں لیکن وہاں بھی نمازیوں کے نسبت طالب برکت زیادہ تھے۔ (۳۴)

محمد رفیق ڈوگر نے اپنی سیاحت کے دوران سیدہ سکینہ کا مزار بھی دیکھا اور اس کے باہر کے مناظر بھی پیش کیے ہیں کہ کس طرح لوگوں کی ایک بھیڑ تھی جو ادب واحترام میں تھے اور نیاز و خیرات کے لیے وہاں مقامی لوگ، سیاحت اور مسافر سے طلب کر رہے تھے اور سیاح بھی حسبِ توفیق تعاون کر رہے تھے۔ مصر پر ایک عرصے تک مسلمان فاطمیوں کی حکمرانی رہی ہے۔ اس لیے ان کا قبرستان بھی مخصوص تھا۔ محمد سعید جاوید نے ان قبرستان کی منظر کشی یوں پیش کی ہے کہ:

ایک وسیع و عریض قبرستان میں ایک ترتیب سے سینکڑوں قبریں بنی ہوئی تھیں جن کی تعمیر میں وہاں قریبی چٹانوں سے ملنے والا پتھر ہی استعمال کیا گیا۔ اس قبرستان میں عام لوگوں کے علاوہ ان کے رؤسا اور امراء کے چھوٹے چھوٹے مقبرے بھی تھے جو زیادہ اونچے تو نہیں تھے لیکن ان پر گول گول گنبد بنے ہوئے تھے۔ (۳۵)

اس قبرستان کی صفائی ستھرائی بھی نہیں کی گئی تھی اور یہاں سیاحوں کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا کیونکہ یہاں قبروں کے سوا دیکھنے کے لیے اور کچھ بھی نہیں تھا کئی قبریں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھیں۔ وقت کی رفتار نے حکمرانوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ جتنی صفائی، ستھرائی اور دلچسپی کا سامان عجائبات گھر میں دیکھنے کو ملا،

اس کا ایک بھی حصہ یہاں نہیں تھا۔ یہ موجودہ مصری حکمرانوں کی غفلت تھی یا سیاحوں کی عدم دلچسپی تھی کہ یہاں پر سرمایہ صرف نہیں کیا گیا۔ باوجود اس کے فاطمی حکمرانوں نے قاہرہ اور مصر میں جدید ادارے، مساجد اور انتظامی نظم و نسق کو مستحکم کیا اور مصر میں مساجد کا جال بچھا دیا۔ مصر میں ہنوز تاریخی مزارات کثرت میں موجود ہیں۔ جہاں لوگ اور سیاح آکر تاریخ سے سبق سیکھتے ہیں اور ان مزارات کا معائنہ و مشاہدہ کرتے ہیں جنھوں نے مصر کی تقدیر تبدیل کرنے میں اپنا مقدور بھر حصہ ڈالا اور تاریخ کے عمل کو تیز کرنے میں سعی کی۔

سفر نامہ نگاروں نے ان مزارات کی تاریخ اور روایت کو بھی لکھنے کی پوری کوشش کی جہاں اختلاف نظر آیا وہاں اپنی بھی رائے رکھی ہے۔ جس کی واضح مثال، مقام حسین علیہ السلام اور مزارِ زینب ہے۔ بعض سفر نامہ نگار وہاں جا نہیں سکے اور جو گئے انھوں نے وہاں کی منظر کشی بھی بیان کی اور روایت کو بھی قلمبند کیا۔ ویسے بھی سیاح کی نگاہ تاریخ شناس ہونی چاہیے، تاریخ پر دسترس نہ بھی ہو، لیکن اتنی معلومات ضرور ہونی چاہیے کہ اپنی رائے دے سکیں قبول اور رد کے لیے نقطہ نظر پیش کر سکیں اور اکثر سفر نامہ نگاروں نے یہی کیا ہے۔ جس سے ان کی تاریخ سے وابستگی کا علم ہوتا ہے۔

مصر میں اسوان کے قریب سر آغا خان کا مزار بھی موجود ہے۔ محمد شاہ آغا خان پاک و ہند کی عظیم شخصیت میں ایک ہیں جن کی کاوشوں سے ریاستِ پاکستان معرضِ وجود میں آئی۔ ان کی مستقل رہائش یورپ میں رہی لیکن علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں کے کہنے پر انہیں آب و ہوا تبدیل کرنی پڑی۔ نیز انھوں نے مصر کے شہر اسوان میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کی آب و ہوا اور موسم راس آیا اور یہیں رہائش اختیار کر لی اور وہیں پر زمین خرید کر اپنا محل بنوایا۔ انھوں نے اپنے محل پر سفید رنگ کروایا، جس وجہ سے وائٹ ہاؤس کا نام دیا گیا اور اپنی چوتھی بیوی کے ساتھ موت تک وہیں پر مقیم رہے۔

> ان کا انتقال ہوا تو وصیت کے مطابق ان کی تدفین اسی محل کے اوپر چاروں طرف پھیلی ہوئی ریت کے عین وسط میں ایک اونچے ٹیلے پر کی گئی۔ ان کی شریک حیات نے وہاں ان کا ایک خوب صورت مزار تعمیر کروایا۔ بعد ازاں جب ان کی شریک حیات بھی فوت ہو گئیں تو ان کو بھی یہیں دفن کیا گیا۔ (۳۶)

مقبرہ محمد شاہ آغا خان بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ انھوں نے اپنا محل شاہ مقام پر بنایا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہاں پر آبادی بڑھتی گئی اور انھوں نے اپنی زندگی میں مصر کی فلاح و بہبود کے کئی منصوبے مکمل کروائے تھے۔

سفر ناموں میں تاریخی مزارات کو بڑی عقیدت واحترام کی مرصع سازی اور پیکر کشی کے ساتھ بیان کیا گیا۔ جہاں بزرگوں کا ذکر آیا وہاں عبارت میں عقیدت کے پھول جھڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی سفر نامہ نگاروں کا کمال ہے کہ انھوں نے مزارات کی حالت، صورت حال اور واقعات کو سچائی اور صداقت سے پیش کیا۔ کہیں بھی مغالطہ یامبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ صداقت اور حقیقت نگاری کو اہمیت دی گئی ہے۔

جامعہ الازہر:

مسلمانوں نے جب مصر کو فتح کیا تب یہاں مساجد اور درس وتدریس کے لیے ادارے بنائے گے۔ جامعہ الازہر فاطمیوں کی دین ہے اور اس کا نام بھی آنحضرت ﷺ کی بیٹی فاطمۃ الزہرہ کے نام سے مسجد تیار کراوئی گئی اور اسی مسجد کے صحن میں درس وتدریس کا نظام بھی شروع کیا گیا۔ جامعہ الازہر کے متعلق شبلی نعمانی اور سر سید احمد کان نے بھی لکھا ہے۔ انھوں نے اس مدرسے کو بڑی باریک بینی سے دیکھا اور یہاں کے تدریسی نظام کا مطالعہ ومشاہدہ بھی کیا نیز بعض سفر نامہ نگاروں نے مشاہدہ پیش کیا ہے لیکن تاریخ بیان نہیں کی۔ جبکہ یعقوب نظامی نے اس کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> جس دن ہم الازہر پہنچے اس سے ایک ہزار چھتیس سال قبل ۹۷۱ع میں اس عظیم درسگاہ کی بنیاد خلیفہ المغز الدین اللہ کے ایک فوجی کمانڈر گوہر السکلی نے رکھی تھی۔ حضور اکرمؐ کی چہتی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہر کے نام کی مناسبت سے اس درسگاہ کا نام "الازہر" رکھا۔ دوسال کے اندر اندر مسجد تعمیر ہوئی۔ مصر میں یہ فاطمی دور تھا۔ چنانچہ بہت عرصہ یہاں فاطمی عقیدہ کے مطابق تعلیم دی جاتی رہی، جب سلطان صلاح الدین ایوبی برسر اقتدار آئے تو انہوں نے فاطمی تعلیم کا خاتمہ کر کے حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی عقیدہ کے مطابق تعلیم جاری کروائی۔[۳۷]

اس درس گاہ اور مسجد کی بنیاد فاطمی عہد میں رکھی گئی۔ اس لیے یہاں اہل تشیع مسلک کے بہت بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ بعد میں صلاح الدین ایوبی نے اس مسلک کی تعلیم وتربیت کو ختم کر کے دیگر فقہ کو اولیت دی۔ یہ درس گاہ وسیع وعریض ایراضی پر محیط ہے اور اس کے دیگر تمام شہروں میں شاخیں بھی ہیں۔ نیز ایک کیمپس فلسطین کے علاقہ غزہ میں بھی موجود ہے۔ ایک ایسی درس گاہ جس کی حیثیت یونیورسٹی جیسی ہو گئی ہے۔ موصوف یعقوب نظامی ایک دفعہ دیکھنے سے جی نہیں بھرا، انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جمعہ کی نماز یہاں پڑھنے کا منصوبہ طے کیا اور جب جمعے کا دن آیا تو انھوں نے مسجد کے امام اور خطیب کا خاکہ یوں پیش کیا:

ٹھیک بارہ بجے محراب کے قریب اندر کی طرف سے دروازہ کھلا اور چھ فٹ کے لمبے چست اور باوقار ایک صاحب مسجد میں داخل ہوئے جن کے سر پر ٹوپی اور چہرے پر برائے نام داڑھی تھی۔ یہ مسجد کے امام وخطیب شیخ الازہر ڈاکٹر محمد سید طنطاوی تھے۔ شیخ الازہر کی آمد پر قاری صاحب نے تلاوت ختم کی اور تخت پوش سے اتر کر نیچے پہلی صف میں بیٹھ گئے اور امام صاحب محراب کے قریب ایک دس فٹ اونچے ممبر پر سیڑھیوں کے سہارے چڑھے جہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر خطاب کیا۔[۳۸]

سفر نامہ نگار نے امام کی چھوٹی داڑھی پر حیرت کا اظہار کیا اور اسی کے ساتھ اس بات پر بھی تعجب کیا کہ امام نے جو خطبہ دیا تھا وہ عربی اور انگریزی کے رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے پیش امام اور شیخ الازہر کا خطبہ نہیں سنا وہ اخبارات میں پڑھ سکتے ہیں۔ امام سے پہلے قاری صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے جس کی آواز میں مٹھاس اور حلاوت حد درجے کی تھی۔ سفر نامہ نگار نے وہاں کے طلبا سے بھی بات چیت کی اور جامعہ الازہر کی معلومات حاصل کی وہ انتہائی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور مصنف نے وہ یہاں اسی انداز میں درج بھی کی ہے۔

الغرض "مصر کا بازار" سفر نامہ صرف سیاحت پر مشتمل نہیں ہے بلکہ تاریخ و تہذیب کا عکاس بھی ہے۔ الازہر کے مین کمپیس میں پچپن فیکلٹی زیرِ تعلیم ہیں۔ ان میں اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ شریعت، اسلامک اینڈ عرب اسٹڈی، تبلیغ اسلام، کامرس، ترجمہ عربی زبان، سائنس، کیمیا، شعبہ دندان طب، انجینئرنگ اور زراعت کے شعبے میں جہاں خواتین اور مردوں کے لیے الگ الگ فیکلٹی ہے۔ اس درس گاہ میں پی ایچ ڈی اور دیگر تحقیقی کاموں کے لیے سہولیات میسر ہیں۔ نیز پچاسی ممالک کے طلبا زیر تعلیم ہیں جن کا کوٹہ دس فیصد سے زائد نہیں۔ اسی درس گاہ سے محض مذہبی اسکالر نہیں بلکہ ڈاکٹرز، انجینئر اور فزیشن بھی فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

الازہر کا سربراہ شیخ الازہر کہلاتا ہے۔ جس کی معاونت کے لیے ڈپٹی شیخ الازہر ہ ڈائریکٹر اور فیکلٹی کے ڈین بھی ہیں اور شیخ الازہر اس ادارے کے چیئرمین بھی ہوتے ہیں جو سپریم کونسل کی میٹنگ بلانے کے مجاز ہیں۔ نیز یعقوب نظامی کے مطابق:

اس الازہر کی سپریم کونسل بھی موجود ہے جس کے پچاس ممبر ہیں یہ کونسل اس عظیم درس گاہ کی مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی رہتی ہے۔ کونسل کا سربراہ

سیکرٹری جنرل ہوتا ہے جس کا کام نئی مالی اور انتظامی نظام کے بارے میں منصوبہ بندی کرنا ہے۔[۳۹]

اس درس گاہ کو محض مدرسے کی طرح نہیں چلایا جاتا بلکہ ایک یونیورسٹی کی طرح ڈین، چیئرمین، سیکرٹری جرنل اور پھر اکیڈمک اور معاشی معاملات کو چلانے کے لیے کونسل بھی بنائی گئی ہے جس کا کام اس کے لیے انتظامی امور میں معاونت کرنا اور جن ادارہ میں ان کے علما اور طلبا اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں ان کے معاملات کو بھی دیکھنا ہے۔ نیز یہاں کتب خانہ، قرآن مجید کی پرنٹنگ کے لیے قرآن ہاؤس اور میگزین کا اجرا بھی باقاعدگی سے کیا جاتا ہے اور غیر ملکی طلبا کی خورد و نوش کا انتظام بھی احسن طریقے سے سرانجام دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کی عظیم درس گاہ کا درجہ حاصل ہے۔ اس یونیورسٹی کے متعلق سفر نامہ نگار محمد سعید جاوید نے بھی اپنے سفر نامے "مصریات" میں ذکر کیا ہے اور انھوں نے جو منظر کشی پیش کی ہے وہ یوں ہے کہ :

> جب ہم اندر داخل ہوئے تو یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ زیادہ تر طالبات مکمل پردے میں تھیں اور جو نہیں تھیں وہ باحجاب تھیں۔ ساری دنیا سے علم کے پیاسے لوگ یہاں کھنچے چلے آتے ہیں جن میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش وغیرہ کے طالب علم بھی نظر آتے ہیں۔[۴۰]

اس درس گاہ میں یونیورسٹیوں کے طلبا و طالبات ایک ساتھ پڑھتے ہیں خواہ کہ ان کی فیکلٹی الگ الگ ہوتی ہے اور درس و تدریس کی فضا قائم رہتی ہے۔ ہر طرف طلبا و طالبات اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں مصروف تھے جن میں غیر ملکی بھی شامل تھے۔ سفر نامہ نگار کو غیر ملکیوں میں پاکستانی، ہندوستان اور بنگلہ دیشی طلبا بھی نظر آئے جو علم کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ اس درس گاہ نے جید علما اور اسکالر پیدا کیے تھے اور عظمتِ رفتہ کو بحال رکھنے کے لیے یہاں کے اساتذہ اور طلباء تحقیق میں مصروف تھے۔ سفر نامہ نگار نے ایک خاص پہلو کی جانب توجہ مبذول کرائی کہ اب یہاں کے علما کے فتوے اپنی وقعت اور اہمیت کھو چکے ہیں اور اس کی وجہ اور اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ یہ رائے مصنف کی ذاتی ہونے کے باوجود ایک تاریخی حقیقت رکھتی ہے۔ جس سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن انکار ممکن نہیں۔ اس حوالے سے محمد سعید جاوید لکھتے ہیں کہ :

> ان کی آپس میں چپقلشوں، سیاستوں اور گھناؤنی سازشوں نے کسی تحقیق کو سرے چڑھنے ہی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ اب تو ان کے جاری کیے ہوئے فتوؤں کو بھی ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ اکثر مقامی علما تو اب اس عظیم ادارے کے جاری کئے ہوئے فتوؤں کو

مانتے ہی نہیں اور اس کو بھی فقہ اور مسلک کے نہ ختم ہونے والے چکر میں پھنسا کر
مشکوک بنادیتے ہیں۔(۴۱)

ایک مدت تک فاطمی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ پھر شافعی مسلک کو اولیت دی گئی بعد ازاں فاطمی کے علاوہ تمام فقہ اور مسلک کی تدریس شروع کی گئی۔ لازم ہے تضاد، سازش اور چپقلش کو تقویت ملتی تھی اور سفر نامہ نگار نے بھی شاید اشارتاً اس طرف توجہ مبذول کرائی ہو اور سعید صاحب نے جن توقعات کو پروان چڑھایا تھا اس کی تشفی نہ ہو سکی۔ وہ اس یونیورسٹی کو دیکھ کر متاثر نہ ہوئے اور نہ ہی اس یونیورسٹی کی سحر میں محو ہوئے۔ انھیں ایک عام سی یونیورسٹی لگی جس کا اظہار انھوں نے بڑی فراخ دلی سے کیا۔

سفر نامہ نگار کی یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے تاثر اور تجربے کو برملا جرات مندی سے اظہار کرے کیونکہ یہ اس کے اپنے ذاتی تجربات کا اظہار ہے۔ جو نجی اور ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محسن میگھانہ نے اپنے سفر نامے میں اس کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے اور اس کی تاریخی اہمیت اور افادیت کو بڑی عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے حرف حرف میں احترام اور حلاوت کی مٹھاس بھری ہوئی ہے۔ نیز ان کا احترام قابل تعریف ہے جو ہر اہل علم و دانش کو درس گاہ سے ہونا چاہیے۔ یہاں کی درس و تدریس کے منطق بھی لکھا اور اس کے آغاز و تعمیر کے حوالے سے بھی احساساتی عبارت رقم کی اور تصویریں بھی بنوائی۔ بعد ازاں دل بھر کر درس گاہ اور مسجد کو دیکھا۔ انھوں نے جامعہ الازہر کے حوالے سے قاری عبدالباسط کی تلاوت کا بھی ذکر کیا کہ یونیورسٹی سے پہلے اس کے تصور ابھر کر آئے کہ وہ عظیم درسگاہ جس نے بڑے بڑے جید قاری اور علماء پیدا کئے اس کو دیکھنے کے لیے ان کی بے قراری اور اضطرابی کیفیت مچل پڑی تھی۔ چنانچہ ساری کہانی رقم کرنے کے بعد ڈاکٹر محسن میگھانہ "حسن مصر" میں لکھتے ہیں:

ہم جب جامعہ الازہر کی مسجد میں پہنچے تو تب نماز کا وقت نہیں تھا لیکن ہم مسجد کی صف
پر بیٹھ گئے اور جامعہ کی ساری تاریخ کو اپنی آنکھوں سے اپنے دل میں اتارتے رہے کہ
نجانے پھر یہ لمحات کبھی نصیب ہوں یا نہ ہوں۔(۴۲)

ڈاکٹر محسن میگھانہ نے عقیدت سے جامعہ الازہر کی سیاحت کو ختم کیا جس میں ان کی دلی کیفیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ نیز ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے جامعہ الازہر کی سیاحت کی اور اس کے ساتھ وہاں کے شعبہ اردو کے صدر کے ساتھ ملاقات بھی کی اور وہاں کی طالبات سے بھی مانوس ہوئے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

ڈاکٹر ابراہیم صاحب نے شعبے کے طالب علموں سے میرا تعارف کروایا پھر باری باری طالب علموں نے اردو زبان میں تعارف کروایا۔ شانزہ سعید، شہد سعد، ایمان اور دوسری کئی طالبات کی زبانی عربی لہجے میں ترتلی اردو سن کر بے حد خوشی ہوئی۔(۴۳)

جامعہ الازہر میں جہاں طب، بینکاری، کامرس، انجینئرنگ، اسلامی قانون، فقہ اور دیگر علوم پڑھائے جاتے ہیں وہاں پر اردو بھی پڑھائی جاتی ہے نہ صرف جامعہ الازہر میں بلکہ مصر کے دیگر سات جامعات میں بھی اردو کے شعبہ موجود ہیں۔ لہذا مصنف نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ وہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی کرائی جاتی ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ شعبہ اردو صرف طالبات کے لیے مخصوص تھی، شعبہ کے صدر ایک اور طلبہ کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں کہ :

یہ پاکستان کے شاعر ابدال بیلا پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ اس موضوع پر ہمارے شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی سے ایم فل کی سطح پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ ایک اور طالبہ کی طرف اشارہ کیا کہ فاطمہ بدر الدین ہیں اگلے ماہ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے چھے مہینوں کے لیے اپنی اردو مزید نکھارنے اور رواں بنانے کے لیے جائیں گی۔(۴۴)

اس بات پر ڈاکٹر الطاف نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہاں پر بھی انھیں گھر جیسا ماحول ملے گا بلکہ قاہرہ ہی کی طرح ملے گا نیز سفر نامہ نگار نے وہاں پر اردو کی کتابیں بھی دیکھی اور پاکستان کے معروف شعرا کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ الازہر میں اردو شناسی اور اردو دوستی کے امکانات روشن ہیں۔

سفر نامہ نگار محمد رفیق ڈوگر جامعہ الازہر یونیورسٹی دیکھنے سے محروم رہے۔ کیونکہ جس دن وہ یونیورسٹی دیکھنے گئے تھے اس دن یونیورسٹی بند تھی۔ اس لیے انھوں نے مسجد دیکھنے پر اکتفا کیا اور انھوں نے ساری منظر کشی بھی عمدہ طریقے سے پیش کی اور وہاں کی درس گاہ کا احوال بھی جذئیات کے ساتھ رقم کیا ہے اور جامعہ الازہر کے علما اور طلبا کا تاریخی واقعہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

جامع الازہر کے علما اور اساتذہ نے نپولین کے حضور حاضر ہونے سے انکار کیا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے اس کی سرکوبی کے لیے اپنی فوج کے گھڑ سوار دستے بھیجے۔ اہل ایمان پھر بھی قائم حکمران کی خواہش کے سامنے نہ جھکے اسے اعلان کرانا پڑا کہ وہ

مذہب اسلام کی دل سے قدر کرتا ہے اور ازہر کے علما اور اساتذہ کی اس کے دل میں بڑی وقعت ہے۔[۴۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامع الازہر اسلامی دنیا کی سب سے بڑی درس گاہ ہے جہاں مختلف ادوار میں بڑے بڑے علما پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنھوں نے اپنے علم کی روشنی سے اسلامی تعلیمات کو روشن رکھا۔ یہ ادارہ نہ صرف مصر کے لیے بلکہ تمام اسلامی دنیا کے لیے بڑی اہمیت وافادیت کا حامل رہا ہے۔ وقت کے ساتھ اس کا معیار اور مرتبہ بدلتا رہا۔ نیز اس کو اب یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہے جہاں مذہبی علوم کے ساتھ دیگر دنیاوی علوم بھی دیئے جاتے ہیں۔ جس کے پورے مصر کے تمام صوبوں میں کیمپس ہیں۔

جہاں سپریم کونسل اور ڈین فیکلٹی، شیخ الازہر اس کی معاشی وانتظامی امور کے لیے سر گرداں رہتے ہیں۔ اس ادارے کی تاریخ مصر کی طرح نشیب وفراز سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔ اس کی بنیاد فاطمی عہد میں رکھی گئی۔ مدرسہ، مسجد اور عہد باضابطہ درس وتدریس کا منظم آغاز کیا گیا ہے۔

اس یونیورسٹی کے حوالے سے تمام سفر نامہ نگاروں نے عقیدت احترام کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ کسی نے تاریخ بیان کی اور کسی نے اپنی دلچسپی کا سامان تلاش کیا۔ ہر چند کہ اس یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ بھی قائم ہے جس سے اردو شناسی کو تقویت ملے گی اور پاکستان کے ساتھ دوستی کا رشتہ مزید مستحکم ہو گا۔ یہ ادارہ اپنے سینے میں تاریخ سموئے ہوئے ہیں۔ کئی حملہ آوروں اور حکمرانوں کے طور طریقوں کو دیکھا، برداشت کیا لیکن پھر بھی اپنی عظمت کے ساتھ سر اونچا کیے کھڑا ہے۔ درس گاہوں کی حیات اسی میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ درس وتدریس پر سمجھوتہ نہ کریں۔

دریائے نیل اور منسوب واقعات:

یہ تاریخی اور ابدی صداقت ہے کہ مصر کی تاریخ وتہذیب کی اساس دریائے نیل سے وابستہ ہے۔ جس نے اس کو سرسبز وشاداب رکھا ہوا ہے۔ بلکہ اسی دریا نے وہ محرکات بھی فراہم کیے ہیں۔ جس کی بدولت یہاں آبادی ہوئی، زراعت کو تقویت ملی اور پھر تہذیب وتمدن کے نقوش ابھرنے لگے۔ یہ دریا، دنیا کا واحد دریا ہے جو جنوب سے شمال کی جانب بہتا ہے۔ یعنی مخالف سمت میں بہتا ہے۔ چنانچہ یہ دریا افریقہ کے ملک رونڈا سے نکل کر وکٹوریا جھیل میں ملتا ہے جہاں سے دوبارہ افریقی ممالک سے گزرتے ہوئے سوڈان کے بیچوں بیچ سفر کرتا ہوا ایتھوپیا میں داخل ہوتا ہے اور پھر ایتھوپیا کے پہاڑوں پر مون سون کی بارشوں کا شفاف پانی جو نیلے دریا کی شکل میں

سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے مقام پر ونڈا سے آنے والے سفید دریا میں مل جاتا ہے۔ یوں دونوں دریا مل کر ایک بڑے دریا کی صورت میں مصر پہنچتے ہیں۔

مصر میں دریائے نیل جھیل میں شامل ہو کر مزید آگے بڑھتا ہے۔ یوں چلتے چلتے الاقصر کے پاس سے گزر کر مصر کے درمیان سے ایک آبی لکیر کھینچتے ہوئے قاہرہ پہنچتا ہے جہاں سیراب کرنے کے بعد مصر کے علاقے ڈیلٹا سے ہوتا ہوا چار ہزار تین سو اکتیس میل کا فاصلہ طے کر کے بحر اوقیانوس میں گرتا ہے۔ لمبائی کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے۔

مصر کی پچانوے فیصد آبادی دریائے نیل کے دونوں کناروں اور ڈیلٹا پر آباد ہے۔ مصر میں یہ دریا نیل نبیہ سے داخل ہوتا ہے جہاں دریا کے کنارے آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ جوں جوں شمال کی جانب آتے جائیں آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ جو پانچ سے دس میل کے علاقہ پر دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ قاہرہ کے جنوب میں نیوم کے علاقہ میں یہ وسعت پندرہ میل تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ قدرت کا معجزہ ہی ہے کہ دریائے نیل دنیا کے سب سے بڑے صحرا جس میں کبھی بارش نہیں ہوتی کے بیچ میں سے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہوئے بحر روم میں گرتا ہے۔ دریائے نیل افریقہ کے صحرا کو مشرقی و مغربی صحرا میں تقسیم کرتا ہے۔ چنانچہ پتھر کے عہد سے دریائے نیل کی کہانی شروع ہوتی ہے اور عہد فراعنہ میں دریائے نیل کی عبادت کی جاتی تھی اور میلہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ دریائے نیل کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بھی منسوب ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب بازار مصر میں فروخت کیا گیا تب عزیز مصر نے انھیں خریدا تھا۔ عزیز مصر کی بیوی بی بی زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گئیں اور اپنا دل دے بیٹھی۔ لہذا ایک دن زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام لگایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام بے گناہ اور بے قصور ہونے کے باوجود قید میں رہے اور پھر حکمِ الٰہی سے اس ملک کے وزیر بھی رہے اور مصر کو قحط سالی اور خشک سالی سے بچانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ اسلامی تاریخ کا شاہکار قصہ ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ دریائے نیل کے ساتھ حضرت یوسف کا ایک اور قصہ بھی منسوب ہے جس پر سفر نامہ نگار محمد رفیق ڈوگر نے لکھا ہے کہ:

> بعد از مرگ یوسف علیہ السلام کے جسدِ خاکی کو نیل کے کنارے دفن کیا گیا، اسرائیلی روایتوں کے مطابق نیل کے جس طرف حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بنی وہ سرسبز

ہوا دوسرے کنارے کی کھتیاں خشک ہو گئیں۔ حضرت یوسف کا تابوت دوسرے کنارے منتقل کر دیا تو سرسبز کنارہ خشک ہو گیا اور خشک سرسبز پھر نیل کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے مینار اٹھائے گئے۔ ان کو ایک آہنی زنجیر کے ذریعے ملایا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں ایک بکس میں ڈال کر اس زنجیر سے اس طرح باندھ دیا کہ دریا کے درمیان رہے۔ نیل کے دونوں طرف ہریالی اور خوشحالی پھیل گئی۔(۴۶)

اس اقتباس سے یہ علم ہوتا ہے کہ دریائے نیل کو بھرپور موجزن رکھنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کے جسد خاکی کو کنارے پر دفن کیا گیا لیکن دوسری جانب خشک سالی ہو گئی اس کے بعد دریا نیل کے درمیان میں جسدِ خاکی کو رکھا گیا جبکہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک خاص پتھر میں مقبرہ بنا کر حضرت یوسف علیہ السلام کا جسدِ خاکی اس میں رکھا گیا اور اس مقبرے کو سنگِ مرمر سے بند کیا گیا اور وہ دریائے نیل کے سپرد کر دیا گیا تاکہ مصر میں ہریالی، خوش حالی رہے۔ نیز روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام دریائے نیل کے درمیان سے گزر رہے تھے تب انہیں حکم ہوا کہ یہ پتھر میں بند مقبرہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے پھر انہیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔

دریائے نیل سے دوسری اہم بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بھی منسوب ہے کہ جب انھوں نے فرعون کو سرکشی سے روکا اور دعوتِ حق دیا تب آخری معرکہ دریائے نیل پر لڑا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر دریائے نیل تک آئے۔ جس کا فرعون کی فوج نے پیچھا کیا اور خدا کا حکم نازل ہوا کہ موسیٰ اپنا عصا دریا پر مارو اور موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی دریا پر اپنے عصا کو مارا تو دریا کے درمیان سے راستہ بن گیا۔

دریائے نیل کے ساتھ سب سے اہم واقعہ یہی منسوب ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ٹوکری یا صندوقچہ بھی دریائے نیل میں بہتا ہوا فرعون اور اس کی بیوی کو ملا تھا۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایسے واقعات منسوب ہیں۔ دورِ فراعنہ میں دیگر دیوتا کے ساتھ نیل دیوتا کی بھی پوجا اور عبادت کی جاتی تھی جس کے لیے عجیب و غریب قیاس آرائیاں اور اساطیر واقعات منسوب ہیں۔ اسلام سے قبل یہاں خوب صورت دوشیزاؤں کو دلہن کا لباس ملبوس کروا کے سونا اور جواہرات سے لیس کر کے دریائے نیل میں پھینکا جاتا تھا اور خوشی کے گیت گائے جاتے تھے اور یہ گیت اجتماعی طور پر مل کر گائے جاتے تھے:

دریائے نیل
ہم تیرا خوشی سے استقبال کرتے ہیں
تو زمین سے نکلتا ہے
اور اہل مصر کی پرورش کرنے آتا ہے
تو خوراک دیتا ہے
تو ہم پر کرم کرتا ہے
تو ہمارے لیے سب کچھ بہتر پیدا کرتا ہے
ہماری زمینوں کو سیراب کرتا ہے
تو ہمارے غلے کے گودام بھرتا ہے
کھلیان اور غلے کے گوداموں کو بھرتا ہے
اور غریبوں پر خصوصی کرم کرتا ہے۔(۴۷)

یہ مصر کی عام رسم تھی نیز جب حضرت عمر کے عہد میں عمرو بن العاص نے مصر کو فتح کیا تب بھی یہی رسم جاری تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے فتح کے بعد قبطی بزرگوں کا ایک وفد حضرت عمرو بن العاص کے پاس آیا اور اپنی قدیم تاریخی رسم کے متعلق آگاہ کیا اور اجازت چاہی کہ اس رسم کو ادا کیا جائے تاکہ دریائے نیل ہمیں سیراب کرے اور دریائے نیل یا دیوتا نیل تب پوری جبن سے بہئے گا جب قربانی دی جائے گی۔ جس پر حضرت عمرو بن العاص نے سختی سے منع فرمایا اور ادھر اہل مصر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ نئے حکمرانوں اور ان کے دین کی وجہ سے نیل دیوتا ناراض ہو گیا ہے۔ تب حضرت عمرو بن العاص نے ساری صورتحال سے خلیفہ وقت حضرت عمر کو آگاہ کیا۔ حضرت عمر نے حضرت عمرو بن العاص کو جوابی خط لکھنے کے بجائے دریائے نیل کے نام خط لکھا۔ اس کا متن یہ تھا:

اے دریائے نیل تجھ میں بہنے والے پانی کے اگر تم مالک ہو اور اس کے عوض تم ہر
سال ایک جوان لڑکی کی قربانی مانگتے ہو تو ہمیں تیرے پانی کی ضرورت نہیں اور اگر یہ
پانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مخلوق کے لیے ایک نعمت ہے تو اس پر تیرا اختیار نہیں
بلکہ اس کا مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔(۴۸)

عام روایت ہے کہ اس کے بعد جوان لڑکی کی قربانی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ نیز اسی روایت کو ڈوگر صاحب نے یوں رقم کیا ہے:

حضرت عمر بن العاص بھی پریشان تھے۔ تیسرا مہینہ شروع ہو چکا تھا مگر روایتی سیلاب کا کوئی آثار نہیں تھا۔ انھوں نے قبطیوں کی بیان کردہ روایت اور نیل کی خاموشی کی ساری تفصیل مدینہ لکھ بھیجی۔ چند روز بعد خلیفہ حضرت عمر کا خط موصول ہوا جس میں ایک خط دریائے نیل کے نام بھی تھا۔

اے نیل اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو خشک ہو جا اگر تو اللہ وحدہ لا شریک کے حکم سے بہتا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تمہیں حسبِ سابق جاری رکھے۔ (۴۹)

نیز دونوں عبارتوں میں جزوی فرق ہے جبکہ متن کی روح قائم ہے کیونکہ دونوں سفر نامہ نگاروں نے تاریخی حوالہ جات سے کتب سے رجوع نہیں کیا ہوگا۔ اس لیے متن میں تھوڑا سا فرق ہے۔ لیکن متن کی روح جوں کی توں زندہ رکھی گئی ہے۔ جبکہ سفر نامہ نگار محسن میگھانہ نے بھی دریائے نیل کی اس روایت کو قلمبند کیا ہے۔ انھوں نے بھی سارے قصے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا اور انھوں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ خشک سالی کی بارہویں رات گزرنے کے بعد کنواری دوشیزہ کو دریا کے سپرد کر دیا جاتا تھا اس مسئلے پر حضرت عمر نے دو خط لکھے ایک حضرت عمر بن العاص کے لیے کہ اس رسم کی ادائیگی سے منع کر کے اچھا عمل کیا ہے اور دوسرا خط دریائے نیل کے نام تھا جس کا متن یہ ہے:

یہ خط بندہ خدا امیر المومنین کی طرف سے دریائے نیل کے نام ہے۔ اے نیل! اگر تو اپنی طرف سے اور اپنے حکم سے چلتا ہے اور اس کے عوض ہر سال تم ایک جوان لڑکی کی قربانی مانگتے ہو تو ہمیں تیری اور تیرے پانیوں کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر تو کائنات کو تخلیق کرنے والے اللہ کے حکم سے چلتا ہے اور حقیقت میں اسی نے تجھے چلا رکھا ہے تو پھر اللہ سے التجا کریں کہ وہ تجھے جاری رکھے۔ (۵۰)

دریائے نیل کو شاید اس امر کا غرور تھا کہ وہ دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے چنانچہ حضرت عمر کے خط کے بعد دوسرے ہی دن بعض سولہ میل لکھتے ہیں کہ اونچا ہو گیا تھا اور بعض اکتیس فٹ اونچائی لکھتے ہیں۔ اس خط کے بعد جوان اور کنواری لڑکیوں کی قربانی کا سلسلہ مکمل طور پر ختم ہو گیا اور پھر ایک عرصے تک مسلمانوں کی حکمرانی اور حاکمیت رہی جو ہنوز جاری ہے۔ کئی انقلابات آئے اور گئے لیکن دریائے نیل کی طغیانی برقرار رہی ہے۔ اسی واقعے کو ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے گائیڈ کو بڑے ظرافت کے ساتھ سنایا ہے۔

لڑکوں کے قتل عام سے فرعون کو موسیٰ علیہ السلام نے روکا تو لڑکیوں کے قتلِ عام سے حضرت عمر نے جن کو فاتح مصر عمرو بن العاص نے لڑکیوں کو نیل کی روانی کے لیے دریا میں پھینکنے کی رسم کی اطلاع دی تو حضرت نے دریائے نیل کے نام لکھا کہ تم اگر اپنی مرضی سے بہہ رہے ہو تب تمہاری مرضی اور اللہ تعالیٰ واحد و قہار تمہیں جاری رکھتا ہے تو ہم اللہ سے دعا گوہ ہیں کہ تجھے رواں کرے۔ خط کی پرچی امیر عسکر نے نیل میں پھینکی اور اگلے ہی دن دریائے نیل میں وہ روانی آئی کہ خشک سالی تر سالی میں بدل گئی۔(۵۱)

طنز و مزاح اور ظرافت اپنی جگہ پر لیکن اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی سرکشی اور لڑکوں کے قتل سے منع کیا۔ جس کی ایک پوری تاریخ ہے اور قبطیوں نے قدیم رسم کو جاری رکھا ہوا تھا۔ نیز جب حضرت عمر بن العاص نے مصر کو فتح کیا تب انھوں نے اس جاہلانہ رسم کے خلاف خود بھی منع کیا اور حضرت عمر فاروق سے مشاورت بھی کی۔ انھوں نے دریائے نیل کے نام خط لکھا بعد ازاں یہ جوان کنواری لڑکیوں کی قربانی کی رسم ختم کرادی گئی۔

سچ یہ ہے کہ اہل مصر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عمر فاروق کے ان احسانات کا شکریہ ادا کرتے رہیں تو کم ہے کہ ان کے خط کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دریائے کے نصیب میں روانی اور طغیانی لکھ دی ہے۔

عجائب گھر:

عجائب گھر سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں انسانی تخلیق کی عجیب و غریب اشیا اور فن پاروں کو دیکھنے کے لیے رکھا جائے جنھیں عجوبہ گھر یا میوزیم بھی کہا جاتا ہے۔ مصری تہذیب و تمدن اپنی خاص انفرادیت اور یگانیت کی وجہ سے انسان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہاں انسانی محنت و مشقت نے ایسی ایسی چیزیں تعمیر و تخلیق کی ہیں کہ اس عہد کے انسان کی عقل دھنگ رہ جائے۔ مصری تہذیب و تمدن کے نقوش، دورِ فراعنہ کے بود و باش، طور و اطوار کو سیاح کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔ اس کا مقام التحریر اسکوائر کے ساتھ منسلک ہے۔ نیز عجائب گھر میں مصر کی تاریخ سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ سانس محض فراعنہ کی لاشوں اور نوادرات تک محدود ہے۔ جو سحر انگیزی برٹش میوزیم میں ہے وہ یہاں نہیں لیکن پھر بھی ایک تاریخ ہے۔ مصری حکومت نے اسے پہلی بار ازبکیہ گارڈن میں تعمیر کیا بعد ازاں قاہرہ کے قلعہ کائرہ اسٹاڈیں میں منتقل کیا گیا۔

مصری تاریخ کی طرح اس عجائب گھر کی بھی ایک تاریخ ہے۔ ۱۸۵۵ع میں حکومت نے تمام نوادرات آسٹریا کے سپرد کیے جو دی آنا میوزیم میں ہنوز موجود ہیں لہذا آگٹا میریٹ کی سربراہی میں بلاق میں ۱۸۵۵ع میں دوبارہ سے اسے ترتیب دیا گیا۔ یہ عمارت دریائے نیل کے کنارے پر واقع تھی جب ۱۸۹۱ع میں سیلاب آیا تو اس عمارت کو بھی خاصا نقصان پہنچا اور سیلاب کی وجہ سے اسے غزہ کے قریب وائل پیلس میں منتقل کیا گیا۔ تاہم اسے پھر ۱۹۰۲ میں دوبارہ نیل کے کنارے التحریر اسکوئر پر قائم کیا گیا۔ فرعون کی لاش کی طرح اس کی بھی تباہی و بربادی اور پھر آبادی کی داستان رہی ہے۔ جو بھی سیاح مصر آتا ہے اس عجائب گھر کو دیکھے بغیر مصر کی سیاحت غیر مکمل اور ادھوری رہ جاتی ہے۔

عجائب گھر میں عہد فراعنہ کی تمام چیزوں کو سیاحوں کے لیے رکھا گیا ہے۔ جس میں ممی، نوادرات، مجسمے، سونے، چاندی اور تانبے کے سکے بھی شامل ہیں اور عہدِ فراعنہ کے علاوہ یونانی، رومن اور تاریخی اسلامی کے بھی موجود ہیں اور یہ عجائب گھر دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ نیز سفر نامہ نگاروں نے اس عجائب گھر کو کیسے دیکھا اور محسوس کرنے کے بعد قلمبند کیا۔ یہ خود اپنی ذات میں ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی ملک سیاحت کے غرض عجائبات اس لیے قائم کرتا ہے کہ ایک اس خطے کی تاریخ و تہذیب سے دوسرے لوگ آگاہ ہو ں اور دوسرا پہلو معاشی ہوتا ہے چنانچہ اس عجائب گھر میں داخلے کے لیے ٹکٹ لینا لازمی ہوتا ہے۔ اس سے دونوں مقاصد مکمل ہوتے ہیں لوگ تاریخ و تہذیب سے بھی واقف ہوتے ہیں اور ملک کو معاشی فائدہ بھی ہوتا ہے اور سیاحت کو فروغ بھی ملتا ہے۔ لہذا ہر سفر نامہ نگار نے پہلے ٹکٹ خریدنے کی بات لکھی ہے اور پھر اس کے اندر کی منظر کشی اور صورتحال کو قلمبند کیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ڈاکٹر الطاف یوسف زئی لکھتے ہیں کہ :

> عجائب گھر کی مرکزی عمارت کے سامنے بڑے دالان میں کچھ ٹوٹے ہوئے اور خراب مجسمے رکھے گئے تھے۔ (۵۲)

یہ عجائب گھر میں داخلے کی منظر کشی کی ہے اس کے بعد ایک راستہ نکالتا ہے جو سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا ہے اور وہیں پر خود کار مشین کے ذریعے تلاشی لی جاتی ہے۔ جو مین دروازہ ہوتا ہے اس کے بعد سفر نامہ نگار یوں رقم طراز ہیں کہ :

> صدر دروازے سے گزر کر ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے جہاں اہل فراعنہ کے کئی میٹر طویل مجسمے اس انداز میں رکھے گئے تھے جیسے ان کا دربار لگا ہوا ہو اور امورِ سلطنت پر اجلاس جاری ہو، امنونس کے چہرے سے دہشت اور ظلم کے آثار ٹپک رہے

رہے تھے امنونس کے سامنے ایک کشتی تھی جس کی لمبائی پچاس فٹ تھی، یہ بادشاہ
خوفو کی کشتی تھی امنوس سوم کے ساتھ ان کی ملکہ اور تین بیٹیاں بھی تھیں۔(۵۳)

مصری حکومت نے عجائب گھر کا انتظام اس طرح کیا ہوا تھا کہ گویا اب بھی فرعون اپنی دربار چلا رہے ہوں بڑی ترتیب سے ان کی ممیاں اور مجسمے رکھے گئے تھے کہ سیاح کو دیکھنے سے اندازہ ہو جائے کہ عہدِ فراعنہ کی دربار اور اس کی کارروائی کس طور چلائی جاتی تھی اور ہر فرعون کو اس کے خاندان اور بیوی بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ نصب کیا گیا تھا تاکہ تاریخ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہر چند کہ سیاح کی نگاہ بڑی تیز اور تجسس کی عبارت ہے لیکن مصری حکومت نے مزید آسان کر دیا تھا۔ نیز بڑے ہال کے برابر میں ایک اور کمرا تھا جو ہال کی طرح بڑا تھا ادھر بھی مصری فراعین کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یونانی بادشاہوں اور اکابرین کے مجسمے بھی کثیر تعداد میں تھے۔ دوسری منزل کے حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

عجائب گھر کی دوسری اور تیسری منزل میں حنوط شدہ لاشوں سے منسلک اشیا طلائی
مٹکے، کمر بند، بازو بند کے ساتھ ساتھ چاندی کے برتن، کرسیاں، میزیں، چھوٹی بڑی
کشتیاں، چادریں، کتیرے، جوتے، چپل (سونے، لوہے اور چمڑے سے بنے) دستانے،
موزے، یہاں نمائش کے لیے رکھ دی گئی تھیں۔(۵۴)

سقارہ اور الاقصر کے شاہی قبرستان سے جو چیزیں نکالی گئیں تھیں وہ یہاں سیاحوں کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ زمانہ خوشحال تھا اور پھر فراعین کے سماج کی ساری دولت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس لیے ان کی قبروں سے سونے کے برتن، موزے، چپل، جوتے اور کپڑے برآمد ہوئے تھے۔ الغرض کہ عجائب گھر کئی صدیاں پیچھے لے جاتا ہے اور عہدِ فراعنہ کی طور و اطوار اور انسانی ضروریات کی تمام اشیا سے واقف کروانے میں معاونت کرتا ہے کہ ان کا رہن سہن، چال چلن، کھانے پینے کا طریقہ کار اور استعمال کی اشیا کون سی تھیں جنھیں وہ روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے تھے اور خود کو اہلِ مصر کا خدا تصور کرتے تھے۔ ڈاکٹر الطاف خان نے تیسری منزل کی منظر کشی یوں پیش کرتے ہیں:

عجائب گھر کی تیسری منزل میں مختلف مجسموں کے ساتھ ایک ہی شکل کے مانوس مجسمے
چھوٹے بڑے سائز میں نصب تھے۔ میں نے دیکھتے ہی کہا یہ سامری کا بچھڑا ہے
نا!۔۔۔؟ محمود نے اثبات میں سر ہلایا۔ مسافر کی آنکھوں کے سامنے سورۃ البقرہ کی
آیت کی پٹی چلنے لگی۔ موسیٰؑ ۔۔۔ جبل موسیٰؑ ۔۔۔ چالیس

دن۔۔۔۔ہارونؑ۔۔۔۔آلِ یعقوبؑ۔۔۔۔ سامری نسار۔۔۔ بچھڑے کا
بت۔۔۔۔ موسیٰ کی واپسی۔۔۔۔یاروں کا غصہ۔۔۔۔۔داڑھی سے پکڑنا اور پھر اللہ
کی طرف سے آلِ یعقوب پر عذاب۔[۵۵]

موصوف نے بیچ بیچ میں اپنی رائے بھی دی ہے اور تاریخ کے اوراق بھی پلٹے ہیں جس میں علم کے عمیق موتی دیکھنے کو ملتے ہیں، نیز انھوں نے عجائب گھر کی سیاحت کا اختتام اچھوتا پن سے کیا ہے۔ جو ان کی علمی اور ادبی ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ غرض کہ یہ ان کی تحریر کا خلاصہ ہے کہ وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور قاری کے لیے سوالات چھوڑ جاتے ہیں اور جہاں اپنی رائے دینی ہوتی ہے وہاں گائیڈ سے گفتگو کے دوران رائے دیے جاتے ہیں اور وہ رائے محض گائیڈ کے لیے نہیں ہوتی بلکہ قاری اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ چونکہ عجائب گھر میں رکھی گئی ممیاں، مجسمے اور نوادرات وہ ہی ہیں جو شاہی قبرستان سے نکالی گئی تھیں نیز ان کو دیکھنے کے بعد ہر سیاح کی کیفیت اور تاثر میں مختلف تنوع ملتا ہے۔ جس کو ہر سفر نامہ نگار نے اپنے اپنے ڈھب سے قلمبند کیا ہے جس میں خیال آفرینی بھی ملتی ہے اور پر شکوہ انداز بھی موجود ہے نیز محمد سعید جاوید لکھتے ہیں کہ:

اندر داخل ہوتے ہی ایک خوابناک سے ماحول کا احساس ہوا جس میں ہر طرف مجسموں
اور فرعونوں کے مقبروں سے نکالا ہوا سامان ایک ترتیب سے رکھا گیا تھا کم روشنی سے
ماحول کو اور بھی زیادہ پر اسرار بنادیا تھا کبھی کبھی انجانے خوف سے ریڑھ کی ہڈی میں
سرد سی لہر دوڑ جاتی تھی۔[۵۶]

اس سفر نامہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عجائب گھر میں رکھے ہوئے مجسموں اور ممیاں دیکھنے کے بعد اپنی کیفیات کا ذکر برملا کیا اور ادبیت کو بھی اہمیت دی، جہاں انھوں نے فرعون کی لاش کے جزئیات سے لکھا وہیں پر عجائب گھر کے عملے کے بارے میں بھی بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح سیاحوں کو لچھائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں تاکہ انھیں کچھ پیسے مل سکیں۔ ججن کے لیے انھوں نے سست الوجود جیسا لفظ بھی استعمال کیا۔ انھوں نے عجائب گھر میں جواں مرگ فرعون بادشاہ توت کامون کے تابوت اور مجسمے کو دیکھنے کے بعد تحریر کردہ جملہ بڑی معنویت رکھتا ہے۔

بلا مبالغہ آدھا عجائب گھر تو صرف اسی کنگ توت کے مدفن سے نکالے جانے والے
ساز و سامان پر مشتمل تھا۔[۵۷]

بادشاہ توت خامون کے اشیاء اور مجسمے کا ذکر مکمل کرنے کے بعد آخری جملہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اور ممیاں دیکھتے جاتے ہیں عبرت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ اسی بادشاہ توت کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

> میری توجہ کا مرکز نوجوان بادشاہ توت کا سنہری تابوت تھا۔ میں بڑی دیر تک وہاں کھڑا مسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ اگر میں اس تابوت کا ایک کان بھی کاٹ کر لے جاؤں تو وہ بھی آٹھ دس کلو گرام سے بھلا کیا کم ہو گا اور اسے میری سات نسلوں کا مقدر سنور جائے گا اور وہ عیش کریں گے۔ (۵۸)

یہ موصوف کی حسرت نہیں بلکہ ہر اس شخص کی خواہش کو عیاں کرتا ہے جو بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کماتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اس کا اظہار بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ ایک طرف مردہ ممیاں ہیں دوسری جانب زندہ انسان کی ضروریاتِ زندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ سفر نامہ نگار کی صداقت اور سچائی ہے کہ اس نے دیکھنے کے بعد جو محسوس کیا اور سوچا تھا وہی قاری کے لیے بھی اسی صداقت سے پیش کیا اور کسی بھی تحریر کا حسن اس کی صداقت ہوتی ہے۔ عجائب گھر گھومتے دوران سفر نامہ نگار نے محافظوں کی چالاکی اور رشوت ستانی کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح چند پاؤنڈ لینے کے لیے سرگرداں پھرتے ہیں۔

جب سفر نامہ نگار اوپر کی منزل پر پہنچا تو وہ سرکاری طور پر بند تھا کہ وہاں پر مرمت کا کام جاری تھا پہلے محافظوں نے واپس جانے کا اشارہ کیا جب مصنف واپس جانے لگا تو اس کو اشارہ کیا گیا کہ پانچ پاؤنڈ رشوت کے عوض مردہ فرعون کی ممیاں دیکھ سکتے ہوں، الغرض وہاں پر ہمارے ملک کی طرح پیسے کا بول بالا تھا۔ مصنف نے پانچ پاؤنڈ دینے کے بعد وہاں کا نظارہ اور منظر دیکھا۔ نیز جب انھوں نے فرعون رامیس کی ممی دیکھی تو اس کی آنکھوں کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پھر گیا اور جو انھوں نے تجزیہ کیا وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> یہی فرعون جس نے کسی دور میں اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس وقت بے بسی کی تصویر بنا کاندھوں تک مٹیالی سی پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک چبوترے پر پڑا ہے۔ ایک ملگجی سی چادر اوڑھے وہ اپنے مردہ وجود کے ساتھ دونوں ہاتھ ایک خاص شہنشاہی انداز میں سینے پر باندھے چپ چاپ اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے خلاؤں میں بیتے دنوں کی عظیم یادوں کو تلاش کر رہا تھا۔ (۵۹)

یہ پوری عبارت کا مطالعہ کرنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی افسانے یا ناول کا اقتباس ہے جس میں تخیل کی پرواز بھی ہے اور جملوں کا استعمال بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔ اس فرعون پر لعنت ملامت بھی اس طور کی گئی ہے کہ سفر نامہ نگار کی صریر خامہ بھی نوائے سروش دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ ان کی نثر میں چاشنی کی کیفیت کے ساتھ افقی بھی داخلیت سے جنم لیتی ہے ان کے تاثیر اور تاثر میں الگ ہی خوبی ہے۔

ڈاکٹر محسن میگھانہ نے مفصل تاریخ بیان کرنے کے بعد انتہائی مختصر پیرائے میں عجائب گھر کو پیش کیا ہے۔ جس کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں وقت کی کمی تھی یا کتاب کی ضمانت سے خائف تھے۔ اس لیے انھوں نے صرف توتن خامن کا ذکر کیا اور انتہائی سرسری پیرا گراف لکھ کر آگے بڑھ گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> اس میوزیم کی دو منزلیں ہیں پہلی منزلوں پہ پاپیرس اور قیمتی سکے ہیں۔ اسی پاپیرس کے پودے سے کاغذ بنانے کی ابتدا ہوئی تھی کئی صدی پرانے یہ کاغذ بوسیدہ ہو گئے اسی منزل پر جو سکے ہیں وہ سونے، چاندی، تانبے کے بنے ہوئے ہیں۔ اسی منزل پہ ۱۵۵۰ع سے ۱۰۴۹ع قبل مسیح کے دور کے مختلف مجسمے اور ممیاں ہیں۔ جبکہ اوپر والی منزل پر فرعون کے مختلف ادوار کے نوادارات رکھے گئے ہیں۔ (۶۰)

سفر نامہ نگار نے انتہائی اختصار سے کام لیا ہے لیکن اس اختصار کی وجہ سے قاری کی تشنگی اور تشفی ختم نہیں ہوتی کہ قاری عجائب گھر کے گوشے سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ ہر ایک مجسمے کی جزئیات اور آرائش و تزئین کو پڑھنا چاہتا ہے۔ جو اس کو میگھانہ صاحب کے سفر نامے سے نہیں ملتا اس لیے کہیں کہیں طوالت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ بہر حال دوسرے سفر نامہ نگار رفیق ڈوگر نے بھی اختصار سے کام لیا ہے۔ ان کے اختصار کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مصر پر مختصر لکھا ہے۔ اس لیے اختصار سے بیان کیا گیا ہے اور انھوں نے سفر اور سیاحت کے لوازمات سے زیادہ اپنی گفتگو درج کی ہے۔ جس میں کہیں تعلّی بھی کا بھی شائبہ ہوتا ہے۔ نیز انھوں نے عجائب گھر کے متعلق لکھا ہے کہ:

> اس عجائب گھر میں فراعنہ کے بعد مقابر سے دستیاب ہونے والی بے شمار اشیا اور ممیاں بھری پڑی ہیں صرف ایک فرعون کے مقبرے سے جو چوروں سے کھدائی تک محفوظ رہا تھا اس قدر اشیاء ضرور ملیں کہ عجائبات گھر کا ایک پورا شعبہ ان سے بھرا ہوا ہے۔ زندگی میں کسی فرعون کے زیر استعمال جو اشیا رہتی تھیں وہ سب اس کے مقبرہ، کے

ڈرائنگ روم میں سجادی جاتی تھیں بلکہ اس سے زیادہ اشیا ضروریات بھی وہاں رکھ دیتے تھے۔[۶۱]

ہر چند کہ رفیق ڈوگر مکمل طور پر عجائب گھر دیکھنے سے محروم رہے، جہاں تک انھوں نے دیکھا اس کو رقم کیا اور سمندر کو کوزے میں بند کر دیا عجائب گھر کی جو خصوصیت ہے وہی اختصار سے لکھا۔

ویسے بھی دنیا بھر میں عجائب گھر اسی کو کہتے ہیں جہاں تاریخی نوادرات رکھے جائیں، دستاویزات، سکے، مراسلے اور انتظامی امور کی دیگر اشیا اس س طرح سجائے جائیں کہ سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے مسافر کو دیکھنے کے بعد تاریخ کے اوراق واضح ہو جائیں۔ اسی اصول کو مصری عجائب گھر میں بھی برتا گیا ہے۔ جس کو دیکھنے سے فراعنہ عہد کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور طور و اطوار کی تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ یعقوب نظامی نے عجائب گھر کی سیاحت اور روداد کو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے اور جملے بھی شستہ اور شائستگی سے رقم کیے ہیں۔ انھوں نے عجائب گھر میں داخل ہونے کی کارستانی یوں رقم کی:

> مصر کے عجائب گھر میں داخل ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی شاہی دربار میں پہنچ گئے ہیں، پہلی منزل پر صدر دروازے کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا ہال ہے۔ ہال میں فراعنہ ایک جگہ جمع ہیں اور انہوں نے مشترکہ شاہی دربار لگایا ہوا ہے۔[۶۲]

عجائب گھر میں داخل ہوتے ہی جو تاثر ہوتا ہے اس کی سفر نامہ نگار نے بہترین طریقے سے عکس بندی کی ہے۔

بلاشبہ پہلی نظر میں جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ سحر آخر تک رکھتا ہے اور یہی تاثر اور سحر عجائب گھر میں رکھے ہوئے مجسموں سے تقویت ملتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس عہد میں فوٹو گرافی ابھی ایجاد نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے بت تراشی، سنگ تراشی اور مجسمہ کا فن پروان چڑھا اور مجسمہ سازی بھی ایسی کہ جسے دیکھ کر انسان کی آنکھ دھنگ رہ جاتی ہے۔ اس لیے انھوں نے نفرتیتی کے مجسمے کی جو تعریف کی ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ وہ اس مجسمے کو دیکھ کر جو محسوس کرتے ہیں یوں لکھتے ہیں:

> ان مجسموں میں ملکہ حسن نفرتیتی کا مجسمہ بھی ہے۔ جو سراپا حسن تھی، صراحی دار گردن اور غزالی آنکھیں۔ فراعنہ ان پر جان نچھاور کرتے تھے۔۔۔ میں کافی عرصہ اس کے پاس کھڑا ایسے گھور گھور کر دیکھتا رہا، اس کی خوب صورت نیم واہ آنکھوں میں

عجیب کشش اور سرور تھا۔ میں اس ملکہ حسن میں کچھ یوں کھویا کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا
کہ یہ حقیقی ملکہ حسن نہیں بلکہ پتھر کا صنم ہے۔ (۶۳)

اس ملکہ کے مجسمے کو دیکھنے کے بعد جو سحر انگیزی مصنف پر طاری ہوئی، اس کا انہوں نے پیرائے میں اظہار کیا ہے اور یہ ملکہ قلوپطرہ کی طرح حسین تھیں۔ بس قلوپطرہ ساز شی تھیں اور بادشاہوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا دیتی تھی۔ لیکن اس ملکہ کی حاکمیت فراعنہ پر چلتی تھی۔ نیز ہر سفر نامہ نگار نے کم و بیش انہی باتوں کو دہرایا ہے جو وہاں پر دیکھا الغرض کہ محسوسات اور سحر انگیزی میں فرق ہے اور اس محسوسات کو پیش کرنے کا انداز بھی ہر ایک کا دوسرے سے مختلف ہے، یہی یگانیت اور انفرادیت تحریر کا حسن ہے۔ یعقوب نظامی نے ماضی کا مزار بھی قرار دیا ہے اور جزئیات کو بھی احسن طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ لہذا وہ عجائب گھر کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

عجائب گھر دیکھنے کے دوران جہاں فراعنہ کا ظلم اور جبر کے فراز معلوم ہوئے وہاں ان کا
کاریگروں کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا جن کے فنی کمالات سے فراعنہ کی میتیں ہزاروں
سال سے محفوظ ہیں اور اس قدر محفوظ ہیں کہ بعض کے بال، دانت اور ناخن تک صحیح
سلامت ہیں۔ (۶۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد کے کاریگروں کا کمال ہے کہ فراعنہ عہد کی تمام اشیاء ابھی بھی سلامت ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بڑے محنتی اور اپنے فن پر مہارت رکھتے تھے۔ خواہ وہ سنگ تراشی ہو یا حنوط کا فن ہو۔ اہرام کی تعمیر ہو یا کاشتکاری کا طریقہ کار ہو۔ اتنے مہذب اور ترقی یافتہ لوگ بھی فرعون کے ظلم و ستم کا شکار رہے۔ مصری عجائب گھر عہد فراعنہ کی ایک تاریخ اور تہذیب کو پیش کرتی ہے۔

عہد فراعنہ کی رسومات اور رہن سہن دیکھتے ہوئے اس عہد کے محنت کش عوام پر رشک ہوتا ہے کہ اس عہد کا فنونِ لطیفہ اس قدر رسا اور اعلیٰ تھا۔ تاہم فراعنہ کی داستان ظلم سے عبارت ہے اور لوگوں کی کہانی کمال فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس عجاب گھر کے علاوہ مصر میں ایک اور عجائب گھر بھی ہے جو کاپٹک میوزیم یعنی قبطی عجائب گھر کے نام سے مشہور ہے۔ اس عجائب گھر میں کچھ پرانے برتنوں، کپڑوں اور تاریخی نوادارات اور تصویروں کے سوائے مقدس کتابوں کے نسخے رکھے ہوئے ہیں جو قبطی عہد سے تعلق رکھتی ہیں جو قدیم عیسائی تھے اور خود کو

مصری عیسائی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اسلام کی فتح سے قبل اسی کی حکمرانی تھی۔ لہذا مصر اپنے وجود میں ہی عجائب گھر ہے۔

مذہبی عبادت گاہیں:

مصر پر تاریخی طور پر مختلف مذہبی عقائد کی حکمرانی رہی ہے اور جس مذہب کی حاکمیت تھی اس نے عبادت گاہیں تعمیر کروائیں۔ جس میں مندر بھی ہیں اور مساجد بھی شامل ہیں۔ رومیوں اور یونانیوں کی عبادت گاہیں بھی شامل ہیں۔ نیز عہدِ فراعنہ کی مذہبی عبادت گاہیں مندر کی صورت میں ملتی ہیں اور ہر فرعون اپنی پسند اور خواہش کے مطابق مندر کی تعمیر، توسیع اور تزئین کرواتا رہا۔

مصر میں دنیا کا چار ہزار سال پرانا اور سب سے بڑا مندر بھی دریافت ہوا ہے۔ عہدِ فراعنہ میں مندروں کی بہتات تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے مندر ریت کی لپیٹ میں آئے اور ختم ہو گئے۔ باقی جو چند مندر دریافت ہوئے ہیں ان میں الاقصر شہر میں کرناک مندر قابل ذکر ہے۔ اس مندر کے لیے کہا جاتا ہے کہ کمبوڈیا میں بدھ مت کے عظیم الشان آنگ کور واٹ مندروں کے بعد یہ دنیا کا دوسرا بڑا مذہبی عمارتوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں ایک مندر نہیں بلکہ مندروں کا جال تھا۔ مصری حکومت نے سیاحت کی غرض سے سب سے بڑے حصے کو کھولا ہے جب کہ تین حصے اپنی خستہ حالی کی وجہ سے عوام کے لیے بند کر دیئے ہیں۔ تاہم یہ تاریخی مندر جہاں واقع ہے اور محلات کا ایک مجموعہ تھا، فرعون رعمیس ثانی نے اور اس سے پہلے کچھ بادشاہوں نے اس علاقے کو اپنا پایا تخت بنایا ہوا تھا اور یہاں سے بیٹھ کر پورے مصر پر حکمرانی کرتے تھے۔ سفر نامہ نگار محمد سعید جاوید اس مندر کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ:

> فرعونوں کے اس عظیم الشان معبد میں داخل ہوئے تو ہر طرف ایک خواب زدہ سا ماحول بنا ہوا تھا۔ مندروں کے بیسیوں فٹ اونچے اور گول پتھریلے ستونوں کے بیچ میں گھومتے پھرتے سیاح مسحور کن نگاہوں اور بے یقینی کی سی کیفیت سے ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ (۶۵)

آج سے ہزاروں سال پہلے بنایا ہوا مندر اب بھی انسانی فہم و دانش پر سحر طاری کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی تعمیر میں انسانی محنت و مشقت کا بھی کارنامہ ہے۔ جس نے ایسا عظیم مندر تعمیر کیا یہ مندر

بڑے بڑے ستونوں پر قائم تھا اور پتھر گول تراشے گئے تھے۔ پتھروں کو تراشنا اور اسے نصب کرنا انتہائی وقعت کا کام تھا۔ لیکن اس وقت کے لوگ خوش اسلوبی سے یہ کام اسر نجام دیتے تھے۔ مندر کے صدر دروازے پر بڑے بڑے مجسمے نصب کیے گئے تھے جو انسان سے بھی کئی فٹ بڑے تھے۔ جنھیں دیکھنے کے لیے سر آسمان کی جانب کرنا پڑتا ہے۔ کہیں پر فرعون کے ہاتھ سینوں پر رکھے ہوئے تھے اور کہیں پر کھلے ہاتھوں والے فرعون کے مجسمے لگے ہوئے تھے۔ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جن فرعون نے اپنی زندگی میں مجسمے تیار کروائے تھے ان کے ہاتھ کھولے ہوئے رکھے گئے اور جن کے ہاتھ سینوں پر بندھے ہوئے ہیں ان کے مجسمے مرنے کے بعد تیار کیے گئے۔ یہ بات خود تحقیق طلب ہے۔ کرناک مندر میں بادشاہ رعمیس ثانی کے مجسموں کے متعلق سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

> ہر طرف دیوتاؤں کے بیٹھے اور کھڑے ہوئے مجسموں کی ایک فوج ظفر موج نظر آئی تھی۔ بادشاہ رعمیس ثانی کے دیو ہیکل مجسمے بھی اس احاطے میں جگہ جگہ نصب تھے اور اگر سچ پوچھیں تو لگتا تھا کہ یہ مندر بھی غالباً اسی کے بنائے ہوئے تھے کیونکہ جدھر دیکھتے تھے ادھر وہی ہی وہ تھا۔(۶۶)

اس مندر میں بادشاہ رعمیس ثانی کے ان گنت مجسمے تھے۔ اس کے علاوہ ملکہ نفرتیتی کا خوب صورت مجسمہ بھی تھا جو اپنے شوہر کے ہمراہ کھڑی تھیں اور فرعون اخناتن کا مجسمہ بھی نصب ہے۔ اسی مندر کے باہر احاطے میں ایک قدیم تالاب کے آثار بھی نمایاں ملتے ہیں جہاں شاید عبادت ہوتی ہو گی۔ نیز یہ مندر اپنی اونچی اور مضبوط سنگلاخ کی بنا پر تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا تھا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فرعون بادشاہوں اور ملکاؤں کے مرنے کے بعد آخری رسومات کے لیے جہاں لے جاتے تھے وہیں پر ان کی یاد میں ایک مستقل مندر کی تعمیر کی جاتی تھی۔ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے، تب مصر کے مختلف شہروں میں ان گنت مندر ہوتے جو شاید وقت اور موسم کی تبدیلی اور حکمرانی کے ساتھ ساتھ ضائع ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ کرناک مندر کے علاوہ رعمیس ثالث کا مندر بھی ابھی تک قائم ہے جو الاقصر کے باہر پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہے۔ ہر چند کہ جہاں رعمیس ثالث کا مندر ہے وہاں پر کھنڈرات سے یہ اندازا ہوتا ہے کہ یہاں پر اس کے علاوہ دیگر مندر بھی تھے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں:

رعمیس ثالث کے مندر کا داخلی راستہ ایک پتھریلے قلعے کی طرح تھا جو زمین سے کافی بلند بنایا گیا تھا اور اندر داخل ہوتے ہی ہر طرف دیو ہیکل اور بلند ستون بڑے بڑے ہال ، کمرے اور بادشاہ کے مجسمے نظر آئے تھے۔(۶۷)

یہ مندر بھی اپنی تعمیر کی نادر مثال ہے۔اس کی دیواروں پر دیگر مقبروں کی طرح جانوروں، پرندوں اور دیگر اشیا کے نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ جو ان کی اپنی زبان میں تاریخ لکھی تھی۔ ہال اور کمروں کی وجہ یہ تھی کہ یہاں لوگ عبادت اور چڑھاوے کے دوران رہتے ہونگے۔اس لیے اتنے کمروں کا انتظام کیا گیا تھا یا پھر مندر کا خیال رکھنے اور پرویت و پجاری بھی یہیں پر رہتے ہوں گے ہر چند کہ یہ مندر اپنے سینے میں ایک تاریخ رکھتے ہیں جو سیاح کے لیے باعثِ حیرانی بھی ہے اور انسانی فنِ تعمیر کی عمدہ مثال بھی ہے۔ اسی مندر کے ساتھ ایک اور مندر بھی ہے جو اس مندر سے دور اوپر پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے یہ مندر بھی اپنی تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ اس مندر کے ضمن میں سفر نامہ نگاریوں لکھتے ہیں کہ :

یہ مصر کی ایک انتہائی طاقتور فرعون ملکہ ، ششپسوت کا ایک شاندار اور وسیع و عریض مندر تھا جو ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔اس مندر کی تعمیر میں کوئی پندرہ برس لگے تھے اور یہ اس ملکہ نے اپنی زندگی میں ہی تیار کروالیا تھا۔(۶۸)

یہ مندر دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک انتہائی وسیع و عریض ہال بھی تعمیر کیا گیا اور اس عمارت کی طرزِ تعمیر یونانیوں کی عمارت سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ نیز یہ مندر پندرہ برس میں ملکہ نے خود تعمیر کروایا اور وقت کے ساتھ اس میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی اس کو مصری حکومت نے مرمت اور تجدید نو میں کئی برس لگے۔تب کہیں جا کر اس مندر کو اصلی حالت میں بحال کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہر چند کہ یہ عمارت انتہائی دلکش اور پر کشش ہے۔اس مندر کے زیریں منزل میں بے شمار ستونوں اور برآمدوں کے اوپر تعمیر کیا ہوا ایک بہت وسیع چبوترہ بھی ہے۔ جس میں اس ملکہ کے بے شمار مجسمے رکھے ہوئے ہیں اور روایتی انداز میں دیواروں پر تحریروں سے اس ملکہ کی تاریخ اور تعریف کندہ کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ چند مندر ابو سمبل کے علاقے میں دریافت ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان مندروں کی نشاندہی ابو سمبل چرواہے نے کی تھی۔اس لیے اس علاقے کا نام اسی چرواہے سے منسوب ہو گیا ہے۔ یہاں دیگر فرعونوں اور نیوبن حکمرانوں کے علاوہ مشہور بادشاہ رعمیس ثانی اور ملکہ نفرتاری کے مندر بھی دریافت ہوئے تھے۔ان دونوں یعنی رعمیس ثانی اور اس کی ملکہ نفرتاری کے دیو ہیکل مجسمے پہاڑ کو کاٹ کر بنائے گئے تھے اور

وہیں پر ان کا مندر بھی موجود ہے نیز اس مندر کی تبدیلی کی بھی پوری ایک کہانی ہے۔اب یہ مجسمے اسوان ڈیم سے کافی دور ہیں۔ چنانچہ اس مندر کی تبدیلی کی پوری کہانی محمد سعید جاوید نے تفصیل سے لکھی ہے اور انھوں نے ان مندروں کا معائنہ اور مشاہدہ بھی کیا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ :

> یہ دونوں مندر بہت ہی عظیم اور دیو ہیکل تھے۔ بادشاہ رعمیس کے مندر کی بلندی کوئی سو فٹ اور چوڑائی ایک سو پندرہ فٹ تھی جبکہ اس میں تراشے ہوئے بادشاہ کے چاروں مجسموں کی اونچائی ستر فٹ کے لگ بھگ تھی۔ دوسری طرف ملکہ نفرتاری کا مندر چالیس فٹ اونچا اور بانوے فٹ چوڑا تھا جبکہ اس میں کھڑے ہوئے بادشاہ رعمیس ثانی اور ملکہ نفرتاری کے چھ مجسموں کی اونچائی تیس فٹ کے قریب تھی اور یہ سب کھڑے ہوئے تھے۔[۶۹]

انسان کا عبادت سے گہرا تعلق رہا ہے اور عہدِ فراعنہ کی ایک رسم تھی کہ بادشاہوں کے مندر الگ بنائے جاتے تھے۔اس لیے بادشاہ رعمیس ثانی اور اس کی ملکہ نفرتاری کا مندر بھی تعمیر کروایا گیا۔ یہ مندر بیس برس میں بن کر تیار ہوئے تھے۔ان مندروں کے عقب میں ایک چھوٹا سا مندر تھا جہاں بادشاہ رعمیس اور ملکہ نفرتاری کے مجسمے نصب تھے جس میں ان کی زندگی کے مختلف لمحات کی عکاسی پیش کی گئی تھی۔ کہیں ان کو میدان جنگ میں دکھایا گیا اور کہیں تاجپوشی کی رسم ادا کرتے ہوئے اور کہیں پر اپنی جیت کا جشن مناتے ہوئے مجسمے تعمیر کیے گئے تھے۔ لیکن ہر مقام اور ہر جگہ پر ملکہ نفرتاری ان کے ہمراہ دکھائی گئی ہے۔ نیز ان کے مندروں کے گنبد بھی عظیم الشان بنائے گئے تھے۔

عہد فراعنہ کے مذہبی عبادت گاہوں میں صرف مندروں کے کھنڈرات اور جن کا ذکر کیا گیا ہے وہی دریافت ہو سکے ہیں۔ یونانیوں کی عبادت گاہیں یا رومن کی عبادت گاہیں اس طرح دریافت نہیں ہو سکی ہیں جب اسلام نے اس خطے کو اپنا جائے مسکن بنایا۔تب یہاں پر مساجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ مساجد میں بھی چند ایسی مسجدیں ہیں جنھیں تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ جن میں مسجد امام حسین اور جامعہ الازہر قابل ذکر ہیں۔ ہر چند کہ ان کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ مسجدِ صحابہ بھی تعمیر کا نادر نمونہ ہے اور مسجد سلطان حسن رفاعی مسجد اور مسجد علی بھی تعمیر اور تاریخ کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔

تاریخی شہر:

مصر چونکہ خود ایک تاریخی اور تہذیبی خطہ رہا ہے اس لیے یہاں کئی مشہور شہر بسے اور اجڑے بھی ہیں۔ دار لخلافہ بھی بنتے اور بدلتے رہے ہیں۔ خود عہدِ فراعنہ میں بھی مستقل دارالخلافہ کوئی ایک شہر نہیں تھا۔ ہر فرعون نے اپنی مرضی سے شہر کو منتخب کیا اور اس کو آباد کیا۔ اسی شہر میں عبادت گاہیں، بازار اور محلات تعمیر کیے گئے۔ اس طرح یہ آبادی بدلتی رہی اور شہر کی تعمیر بھی ہوتی رہی لیکن اس کے باوجود چند تاریخی شہر اپنا تشخص رکھتے ہیں۔ وہی رعب اور دبدبہ بھی رکھتے ہیں جس کو مسلمان کمانڈر حضرت عمر بن العاص نے فتح کیا تھا۔ اس شہر پر اس وقت عیسائیوں کی آبادی تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے جب اس شہر کو فتح کیا تب اس کے برابر میں خیمے لگائے گئے تھے اور عربی میں خیموں کو فسطاط کہتے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمر کو دار لحکومت منتخب کرنے کے لیے خط لکھا۔ جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ دار لحکومت ایسی جگہ پر تعمیر کیا جائے جو عرب اور مصر کے درمیان میں کوئی دریا نہ آئے تب تمام صحابہ کرام یک آواز ہو کر حضرت عمرو بن العاص کو فسطاط کا کہا لہذا مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا دار لحکومت بنایا اور یہیں سے حکمرانی کی۔

قاہرہ کو فرعون ممفس نے آباد کیا تھا اور پھر چوتھی صدی عیسوی میں رومن نے اس کی تعمیر میں دل چسپی ظاہر کی اور اس کو نئی شکل دی۔ اس شہر کے بسنے اور اجڑنے میں تاریخ کا عمل دخل بھی ہے اور اسی شہر میں طاعون سے دو لاکھ افراد اجل کا شکار ہوئے تھے۔ اس شہر کو واسکوڈے گاما نے شاہد ۱۴۹۹ـ۱۴۹۷ میں دریافت کر کے دنیا میں متعارف کروایا۔ محمد علی پاشا نے اس کو جدید اصولوں پر استوار کیا۔ اس کو مزید ترقی دینے میں اسماعیل پاشا کا اہم کردار ہے جبکہ اس شہر کو آباد کرنے میں خصوصی دلچسپی فاطمیہ دور میں جواہر الفیصل نے لے لی بلکہ بسایا ہی اس نے تھا۔ اس کا رقبہ ۵۲۸ مربع کلو میٹر ہے اور اس کی کل آبادی لگ بھگ ایک کروڑ پر محیط ہے۔ نیز عرب دنیا میں اسے مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا شہر کہہ سکتے ہیں۔

اس شہر کے حوالے سے ایک عجیب و غریب متھ بھی قائم ہے۔ قاہرہ کا مطلب شکست دینے یا فتح کرنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب قاہرہ آباد ہو رہا تھا تب مریخ جیسے نجم القاہر کہتے ہیں وہ ابھر رہا تھا اسی نسبت سے اس کا نام قاہرہ رکھا گیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مصری زبان میں قیر ادہے یعنی مقابلے کی یا لڑائی کی جگہ اور قرین قیاس یہ ہے کہ یہ لفظ بگھڑ کر قاہرہ بن گیا ہو۔

یہ جنگ دو دیوتاؤں کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک طرف سیٹھ Sethاور دوسری طرف ہورس Horous تھا۔ ان دونوں میں شدید گھمسان پڑا۔ شاید اسی وجہ سے اس جگہ کو قیر واہے کہا گیا ہو جو وقت کے

ساتھ بدل کر قاہرہ بن گیا۔ اسی شہر کو ام الدنیا یعنی دنیا کی ماں بھی کہا جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ شہر ایک تاریخ رکھتا ہے۔ مصر کا یہی شہر سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور ماڈرن ہے۔ ایک زبان میں اس ماڈرن قاہرہ کو فسطاط کے نام سے جانا جاتا تھا یا یوں کہا جائے کہ یہ دونوں شہر ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ وقت کے ساتھ فرق ختم ہو گیا۔ قدیم شہر قاہرہ کے متعلق یعقوب نظامی یوں لکھتے ہیں کہ :

> قاہرہ ایک شہر کا نام نہیں بلکہ مختلف بستیوں اور شہروں کا مجموع ہے۔ روزمرہ حکمرانوں نے قاہرہ قدیم میں ایک قلعہ اور شہر کے ارد گرد دیوار تعمیر کروائی تھی یہ قلعہ بالکل اسی جگہ پر تھا جسے آج کل بابلان کہتے ہیں بعد میں اس علاقے پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا عیسائی علما کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم جب بیت العلم فلطین سے مصر آئیں تو اسی علاقے میں ان کا قیام رہا۔ (۷۰)

اسی طرح یہودی علما بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ قاہرہ قدیم میں واقع سینگاگ والی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے اگر شہر کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ شہر آج سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے آباد ہے۔ اس حوالے سے آثار قدیمہ والوں کا اندازہ درست ہو سکتا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ شہر دورِ فراعنہ میں چھٹی صدی قبل مسیح میں آباد ہوا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور تاریخی ممفیس ہے جو قاہرہ تقریباً ۳۲ کلو مٹر دور ہے جو آج سے پانچ ہزار سال قبل سقارہ شہر کے جنوب مغرب میں فراعنہ بادشاہ مینز نے ۳۱۰۰ قبل مسیح میں ممفیس کے نام سے آباد کیا تھا اور یہ شہر تین ہزار سال تک فراعنہ اور دیگر دنیا کے لیے توجہ کا مرکز بنا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا منفرد شہر تھا جسے ایک بادشاہ نے اپنے پائے تخت کے لیے بنوایا۔ نیز یہ شہر اپنے زمانے کا جدید ترین شہر تھا۔ جس میں زندگی کی تمام تر سہولیات میسر تھیں اور اس شہر کے آباد ہونے کے بعد دنیا میں شہنشائیت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ شہر دریائے نیل کے کنارے ایک خوب صورت شہر تھا جس کے ارد گرد سفید پتھر کی دیوار تھی۔ اسی وجہ سے اس کو وائٹ وال شہر بھی کہا جاتا تھا۔ اس شہر میں شاہی دفاتر، محلات، طب خناہ، حنوط کے مراکز وغیرہ ہوتے تھے۔ مندر اور عبادت گاہیں بھی تھیں۔

تیسرا بڑا تاریخی شہر الاقصر ہے جس کو یہ نام عربوں نے دیا تھا۔ اس شہر کو انگریز الکسر پکارتے ہیں۔ پہلے اس شہر کا نام تھبیس تھا۔ جہاں کئی سو سال تک فراعنہ کے کار فرما رہے اور ان کی طاقت کا سرشمہ بھی رہا جو ممفیس کے بعد پانچ سو سال تک دار لحکومت رہا۔ اس کا عروج ۱۵۰۰ قبل مسیح میں اس وقت ہوا جب مصر کے

شمالی علاقے پر چڑھ آئے بادشاہوں نے قبضہ کر لیا تب اس وقت کے فرعون بھاگ کر تھیبس فرار ہو گئے جہاں انھوں نے ایک نیا شہر آباد کیا۔ یہاں فرعون نے دوبارہ طاقت پکڑی اور عوام پر مظالم شروع کر دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کے پہاڑ، صحرا اور دریا نے فراعنہ کے مظالم کو دیکھا اور اس کے گواہ ہیں۔ اب یہ شہر مزارات اور کھنڈرات سے عبارت ہے۔ یہ شہر قاہرہ سے سات سو کلو میٹر کی مسافت پر ہے۔ جبکہ اسی شہر میں کرناک اور الاقصر کا مندر ہے اور ساتھ سے نیل بہہ رہا ہے ہر چند کہ اس شہر کی معاش اب سیاحت پر ہے اور اب یہ گھر قصبہ جتنا دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر کے شمال میں مندر اور اس کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ شہر مصر کا ایک تاریخی شہر تھا جواب صرف تاریخ بن چکا ہے۔ لوگ یہاں سیاحت کے لیے آتے ہیں۔

مصر کا تاریخی شہر اسکندریہ بھی رہا ہے جہاں کی ملکہ قلوپترہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے مشہور رہی ہیں۔ اس شہر کو سکندر اعظم نے ۳۳۱ قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ جو بحرِ روم کے کنارے پر ہے۔ چنانچہ اسکندریہ کے مناسبت سے ہی اسکندریہ کہلانے لگا۔ اور اس کی دوسری وجہ شہرت ملکہ قلوپطرہ ہے۔ مصر کا یہ ساحلی شہر قاہرہ سے ۲۲۰ کلو میٹر دور ہے اور قاہرہ کے بعد مصر کا دوسرا بڑا شہر ہے اور یہ شہر زرخیز ہے یہاں بہت زیادہ ہریالی ہوتی ہے بلکہ یہاں غلہ اس قدر ہوتا ہے کہ پوری مصر کی غذائی ضرورت کو پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شہر کاٹن اور مچھلی کی صنعت کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اسوان شہر، سویز شہر بھی قابلِ ذکر ہیں جو تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور مصر کے لیے نعمت بھی ہیں۔

دیگر مشہور مقامات:

مصر کے دیگر مشہور مقامات سے قلعہ صلاالدین ایوبی کو تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ ہی قلعہ ہے جو انھوں نے صلیبی جنگوں کے دوران بنوایا تھا۔ جو قاہرہ شہر کے قلب میں ہے۔ اس کی دیواریں دس میٹر لمبی اور تین میٹر چوڑی ہیں۔ نیز صلاح الدین ایوبی نے اس قلعہ کے اندر ایک گھر ایک مسجد اور ایک کتب خانہ بھی بنوایا تھا۔ اس قلعہ کی بدولت مصری حکمرانوں نے تقریباً سات صدیوں تک قاہرہ کی حفاظت کی ہے اس قلعے کے دائیں طرف سلطان حسن اور بائیں جانب رفاعی مسجد کی بلند و بالا عمارت اپنی جانب توجہ مبذول کرواتی ہے۔ مسجدِ رفاعی قرونِ وسطیٰ کی عمارات کی بڑی نشانی ہے۔ اس کے کل بارہ ستون ہیں۔ آٹھ ستون دیواروں کے ساتھ پیوست ہیں مرکزی گنبد کو چار ستونوں سے اٹھایا ہوا ہے۔ ہر ستون کی چوڑائی تقریباً دس فٹ اور بلندی پچاس میٹر سے زیادہ ہو گی۔ ان ستونوں پر نقش و نگار اسلامی فنِ تعمیرات کا بہترین نمونہ ہیں۔ مسجد کے اندر رفاعی فرقے سے وابستہ احمد رفاعی کا مزار بھی ہے۔

اسوان شہر میں ہاتھیوں کا جزیرہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ سنگلاتی چٹانوں کا اگر کشتی میں نظاہر کیا جائے تو ان چٹانوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سارے ہاتھی دریا میں گھسے ہوئے ہیں۔ اسی مشابہت کی وجہ سے چٹانوں کے اس سلسلے کو Elephentiono Rocks بھی کہتے ہیں۔ دراصل یہ چٹانیں جن کی بناوٹ ہاتھی جیسی ہے یہ بھی سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جزیرہ پھلائے بھی سیاحوں میں کافی مشہور ہے۔

قاہرہ میں سب سے مشہور مقام یا تاریخی بازار خان الخلیل ہے۔ یہ بازار مسجدِ حسین کے قریب ہے۔ نیز یہاں مصر کی حقیقی زندگی کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس بازار میں مصر کی گذشتہ چھ سو سال کی ثقافت، تہذیب و تمدن چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بازار ۱۳۸۲ع میں قائم ہوا۔ اس وقت مصر میں ترکی کی حکومت تھی یوں ایک عرصے تک اس بازار کا نام ترکی بازار بھی تھا۔ یہاں دکانوں کے ساتھ ساتھ کیفے ہاؤس، قہوہ خانوں، زیورات، ہار سنگار، کپڑے اور دیگر تمام اشیا یہاں فروخت ہوتی ہیں۔ اس بازار میں ہر سودا میسر ہے۔

مصر میں التحریر اسکوئر بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے یہ چوک عرب اسرائیل کی جنگ جو ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ میں ہوئی تھی اس کی یادگار تھی۔ اس کو شہدا چوک بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس چوک کی عرب بہار یا حسنی مبارک کے خلاف جو تحریک چلی تھی اس مناسبت سے آزادی چوک بھی کہتے ہیں۔ ویسے اس چوک کی مختصر تاریخی حیثیت ہے ویسے وہاں گھومنے یا دیکھنے کی کوئی خاص شے نہیں۔ الغرض باقی جو اہم مقامات تھے خواہ وہ تاریخی ہوں یا تہذیبی ہوں ان کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ یوسف کمبل پوش، خان، عجائبات فرنگ، نول کشور پریس لکھنو، سن اشاعت ۱۸۹۸ ، ص ۸۰

۲۔ شبلی نعمانی، سفر نامہ، روم، و مصر شام، مطبع جنت دہلی، سن اشاعت ۱۳۳۵ھ، ص ۱۳۱

۳۔ محسن میگھانہ، ڈاکٹر، حسن مصر، سنگری فیصل آباد، اشاعت اول ۲۰۱۸ء، ص ۶۵

۴۔ ایضاً ص ۶۵

۵۔ محمد سعید جاوید ، مصریات، بک ہوم، لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۵۰

۶۔ ایضاً ص ۵۱

۷۔ یعقوب، نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۳۷

۸۔ ایضاً ص ۳۸

۹۔ محسن میگھانہ ، ڈاکٹر، حسن مصر، سنگری فیصل آباد، اشاعت اول ۲۰۱۸ء، ص ۶۶

۱۰۔ محمد سعید جاوید، مصریات، بک ہوم لاہور، سن اشاعت، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۳

۱۱۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۱

۱۲۔ ایضاً ص ۲۲۱

۱۳۔ ایضاً ص ۲۲۱

۱۴۔ ایضاً ص ۲۲۴

۱۵۔ ایضاً ص ۳۸۔۲۳۹

۱۶۔ ایضاً ص ۲۴۰

۱۷۔ ایضاً ص ۲۴۳

۱۸۔ ایضاً ص ۲۴۴

۱۹۔ ایضاً ص ۲۴۶

۲۰۔ ایضاً ص ۲۵۱

۲۱۔ ایضاً ص ۲۵۲

۲۲۔ ایضاً ص ۲۵۳

۲۳۔ ایضاً ص ۵۴۔۲۵۵

۲۴۔ ایضاً ص۷۹

۲۵۔ الطاف یوسف زئی،ڈاکٹر، نیل کے سنگ،احسنِ ادب فیصل آباد، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۷۲

۲۶۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۸۰

۲۷۔ ایضاً ص۲۹

۲۸۔ ایضاً ص۴۱

۲۹۔ ایضاً ص۴۴

۳۰۔ ایضاً ص۴۷

۳۱۔ ایضاً ص۸۲

۳۲۔ محسن میگھانہ،ڈاکٹر، حسن مصر، سنگری فیصل آباد،اشاعت اول۲۰۱۸ء، ص ۱۳۲

۳۳۔ محمد رفیق،ڈوگر،اور نیل بہتا رہا،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۶ء، ص۱۹۶

۳۴۔ ایضاً ص۱۹۶

۳۵۔ محمد سعید جاوید ، مصریات، بک ہوم،لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۲

۳۶۔ ایضاً ص۱۸۹

۳۷۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص۴۸

۳۸۔ ایضاً ص۵۰۔۴۹

۳۹۔ ایضاً ص۵۱

۴۰۔ محمد سعید جاوید ، مصریات، بک ہوم،لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص۱۰۶

۴۱۔ ایضاً ص۱۰۷

۴۲۔ محسن میگھانہ،ڈاکٹر، حسن مصر، سنگری فیصل آباد،اشاعت اول۲۰۱۸ء، ص ۱۳۰

۴۳۔ الطاف،یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، احسنِ ادب فیصل آباد، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، ص۱۰۴۔۱۰۳

۴۴۔ ایضاً ص۱۰۴

۴۵۔ محمد رفیق،ڈوگر،اور نیل بہتا رہا،سنگ میل پبلی کشینز،لاہور،اشاعت ۲۰۰۶ء، ص۱۹۸

۴۶۔ ایضاً ص۱۹۰

۴۷۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۶۱۔۶۰

۴۸۔ ایضاً ص ۶۱

۴۹۔ محمد رفیق، ڈوگر ،اور نیل بہتا رہا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۲

۵۰۔ محسن میگھانہ ،ڈاکٹر، حسن مصر، سنگری فیصل آباد، اشاعت اول ۲۰۱۸ء، ص ۶۱

۵۱۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، احسنِ ادب فیصل آباد، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۶۱۔۶۰

۵۲۔ ایضاً ص ۶۶

۵۳۔ ایضاً ص ۶۶

۵۴۔ ایضاً ص ۶۶۔۶۷

۵۵۔ ایضاً ص ۷۱

۵۶۔ محمد سعید جاوید، مصریات، بک ہوم، لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۴۴

۵۷۔ ایضاً ص ۴۵

۵۸۔ ایضاً ص ۴۶

۵۹۔ ایضاً ص ۵۲

۶۰۔ محسن میگھانہ، ڈاکٹر، حسن مصر، سنگری فیصل آباد، اشاعت اول ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۸

۶۱۔ محمد رفیق، ڈوگر، اور نیل بہتا رہا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۹

۶۲۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۶

۶۳۔ ایضاً ص ۱۳۷

۶۴۔ ایضاً ص ۱۴۴

۶۵۔ محمد سعید جاوید، سفر نامہ، مصریات، بک ہوم، لاہور، اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۵

۶۶۔ ایضاً ص ۱۲۶

۶۷۔ ایضاً ص ۱۳۶

۶۸۔ ایضاً ص ۱۳۶

۶۹۔ ایضاً ص ۱۹۵

۷۰۔ یعقوب، نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر لاہور، سن اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۳

باب سوم:

اردو سفر ناموں پر مصری تہذیب کے اثرات کا تجزیہ

مصر کی تہذیب دنیا کی اعلیٰ ترین تہذیب میں سے ایک ہے۔اس کے لیے دریائے نیل قدرتی نعمت بن کر نازل ہوا۔ شاید یہی سبب ہے کہ یہاں تہذیب و تمدن کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ خاص آب و ہوا اور ماحول کی وجہ سے زراعت کو تقویت ملی اور جیسے جیسے زراعت نے ترقی کی مصری تہذیب اتنی بلند اور اعلیٰ درجے پر فائز ہوتی گئی۔ عمدہ فصل نے اعلیٰ تہذیب کو جنم دیا۔انھوں نے فصل کی تیاری کے لیے سورج کی برکتوں کو دیکھا اس لیے اس کو بھی دیوتا کا درجہ دیا اور اس کی پوجا کرنے لگے۔ چنانچہ دریا کے دیوتا کو اوسیرس اور سورج دیوتا کو راکا نام دیا۔اسی طرح خوشحالی کا دیوتا بھی بنایا گیا۔ چونکہ یہ انسانی عہد کا وہ زمانہ تھا جہاں ابھی دیوتا اور دیوی کی پوجا کی جاتی تھی اس لیے مصری لوگوں نے بھی ان گنت دیوتا بنائے ہوئے تھے۔ جن کی عبادت کی جاتی تھی۔

مصر کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے اس کا جغرافیہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ خطہ زرخیز اور خوشحال ہونے کے باوجود حملہ آوروں سے کس طرح محفوظ رہا اور اگر اس پر مسلسل حملے ہوتے رہے تو شاید یہ تہذیب پروان چڑھنے سے قبل ہی نیست و نابود ہو جاتی۔اس لیے جغرافیائی حدود نے اس کو محفوظ رکھا ہوا تھا۔اس میں داخل ہونے کے صرف تین راستے تھے جو مشکل اور تنگ تھے۔اس کے جنوب میں دریائے نیل کے ذریعہ داخل ہو سکتے تھے۔ دوسرا مغرب میں بحرِ روم کے ساحلی سرحد سے داخل ہوا جا سکتا تھا۔ تیسرا شمال مشرق میں سینائی میں ہو کر اندر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ لہذا یہ تینوں راستے انتہائی تنگ اور مشکل تھے۔اس لیے اس خطے کی تہذیب اپنی انفرادیت کے ساتھ پروان چڑھتی رہی اور یہاں کے لوگ اپنے دیوتا کی پوجا میں مصروف رہے اور اپنی تہذیب کو فروغ دیتے رہے۔

اس ملک میں پیپرس نام کا پودا ہوتا تھا۔ لوگوں نے اس پودے سے اور دیگر مصالحوں سے ایک موٹی سی چیز بنائی جو کاغذ کی طرح استعمال ہوتی تھی۔اس طرح اس کاغذ کو پیپرس کہتے تھے۔اس کاغذ کے ٹکڑے پر طرح طرح کی تصویریں اور نشانات بناتے تھے اور اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ الغرض کہ کتابیں بھی اسی پیپرس کے ٹکڑوں پر لکھی جاتی تھیں اور ان کو لکڑی کے ڈنڈوں پر لپیٹ کر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس خطے میں پیپرس کا پودا مصریوں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوا۔

اس ملک میں پتھر بھی باآسانی مل جاتے تھے۔ان پتھروں کی موجودگی سے لوگوں نے فنِ عمارت اور فنِ سنگ تراشی کے حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں۔انھوں نے عالی الشان عمارتیں بنائی، محلات تعمیر کیے۔ مندر بنائے اور انہی پتھروں پر طرح طرح کے نقش و نگار تخلیق کیے۔ نیز پتھروں کو تراش کر بت، مجسمے تیار کیے۔اس طرح پتھروں کی وجہ سے اہرام یا پیرامڈ اور ابوالہول بھی بنائے ہیں جو مصری تہذیب کے ہنر اور سنگ تراشی کے بہترین نمونے ہیں۔ پیرامڈ یااہرام واقعی ان کی حیرت انگیز تخلیق ہے کہ انھوں نے کس خوب صورتی سے ان پتھروں کوایک دوسرے کے اوپر رکھا ہے کہ ابھی تک اسی طرح قائم ہیں اور ان کے اندر شاندار اور عالی شان کمرے،ہال تعمیر کیے اور مصری لوگوں نے ہی حنوط کا طریقہ دریافت کیا یا پھر ایجاد کیا کہا جاسکتا ہے۔

ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ ہوگا۔اس لیے مردے کے جسم کو محفوظ رکھا جائے۔ جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے حنوط کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ نیز ہندو مذہب میں بھی دوبارہ زندہ ہونے کا نظریہ ملتا ہے لیکن انھوں نے حنوط کا طریقہ نہیں اپنایا۔یہ صرف مصری تہذیب کی خاصیت تھی کہ مردے کے جسم کو اس طرح دفناتے تھے کہ وہ برسوں تک محفوظ رہے۔ حنوط کی وجہ سے انھوں نے کیمیائی تجربے کیے۔ جس سے ان کے یہاں فنونِ لطیفہ، سنگ تراشی، بت تراشی اور سائنس نے بھی ترقی کی۔ ہرچند کہ مصری تہذیب کا قدیمی سماج کے کام اعتبار سے مختلف طبقات میں منقسم تھا۔ یہاں امراء، مذہبی پروہت، سوداگر، کاریگر اور غلام رہتے تھے۔امراء کے یہاں کثیر جائیدادیں اور جاگریں تھیں۔جو عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے تھے اور یہاں پر اس عہد کا مذہب بھی رائج تھا۔اس لیے پروہت کو بڑی فضیلت اور رتبہ حاصل تھا۔ جبکہ غلام چرواہوں کا کام کرتے تھے۔

محلات و مندر کی تعمیر میں ان سے محنت کروائی جاتی تھی اور مصر کے بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ فرعون نے خود کو دیوتا کی اولاد کہلانا شروع کیا جبکہ اس کے ماتحت دیگر وزراء ہوتے تھے جو صوبوں کو دیکھا کرتے تھے جب فرعون نے خود کو اعلیٰ سمجھنا شروع کیا تب سماجی برائیوں نے جنم لیا۔ فرعون خود کو اعلیٰ وارفع نسل خون سمجھنے کی وجہ سے بہن سے شادی کرنے نکلے تاکہ اعلیٰ خون خراب نہ ہو اور انہوں نے اس کی مثال دیوتاؤں سے تراش لی۔تاہم عہد فراعنہ ظلم و بربریت کا عہد قرار پایا۔ کیونکہ بادشاہت کی بنیاد جبر پر ہوتی تھی۔ لہذا اس کے باوجود ان کے یہاں عورت کو اعلیٰ درجہ حاصل تھا۔

کئی ایک دیوی بھی تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی اور گھریلو زندگی میں بھی عام و خواص نے عورت کو احترام کا درجہ دے رکھا تھا۔ نیز دریائے نیل کی طغیانی اور خوشحالی کے لیے حسین و جمیل لڑکی کی بھینٹ چڑھائی

جاتی تھی اور ان کے یہاں انسان کی قربانی کی مثال بھی ملتی ہے بلکہ ان کے یہاں ایسے تہوار جوش و خروش سے منائے جاتے تھے۔ رقص اور موسیقی کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ علم نجوم اور جادو پر بھی مہارت رکھتے تھے۔ سیاروں کی رفتار اور حرکت کا حساب لگانے میں ماہر تھے اور سال کی مدت کا اندازہ سیاروں کی حرکت اور رفتار سے لگاتے تھے۔ بقول شخص کہ رائج کلینڈر کو ان لوگوں نے بنایا تھا۔ سورج، چاند اور سیاروں کی حرکت اور رفتار کا اندازہ سائے سے بھی لگاتے تھے جو گھڑی کا مترادف تھا جو آگے چل کر وقت کی اساس بنا۔

مصری تہذیب سے کھیتی باڑی کے جو اوزار ملے ہیں وہ بھی اس عہد کی ترقی یافتہ شکل ہیں جبکہ وہاں کا عام پیشہ زراعت کرنا تھا اور اس کے ساتھ کاریگر، حنوط کا فن، سنگ تراشی، پرویت کا الگ شعبہ بھی موجود تھا۔ اپنے عقائد اور نظریات کو انھوں نے جس کتاب میں لکھا تھا اس کا نام "کتاب اموات" ہے اور یہ مصری عقائد کی نمائندہ کتاب ہے۔ دنیا کی تہذیبوں میں شاید یہ پہلی تحریری دستاویز ہے جو دریافت کی گئی ہے۔ ان کے معاشرے کی اساس مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نوعیت کی رہی ہے۔ ان کے معاشرے میں چوری، قتل اور جھوٹ بولنا جرم تھا، تاہم بادشاہ اس کو اس سے استثنیٰ حاصل تھا۔ اس لیے وہ ظالم کی صورت اختیار کر گیا۔ لیکن بادشاہت اپنی ہئیت اور جوہر میں ظلم کی علامت ہوتا ہے۔

فارس میں بھی بادشاہ کو ظلِ الٰہی کہا جاتا تھا۔ حاکم ہمیشہ خود کو خدا کا پرتو یا نور قرار دیتا تھا۔ اس لیے فرعون کا ظالم ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے چنانچہ اس سرزمین کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بھی منسلک ہیں۔ اسی وجہ سے فرعون ظالم نظر آتے ہیں ورنہ ہر تہذیب پر مسلط بادشاہ کی اٹھان ظلم سے عبارت ہے۔ باوجود اس کے مصری تہذیب دنیا کی اعلیٰ وارفع تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ خطہ قبل مسیح سے علم وادب، سیاست اور فنونِ لطیفہ کا مرکز رہا ہے اور اب بھی اپنے اثرات دوسری تہذیبوں پر چھوڑ رہا ہے۔

مصری مہمان نوازی:

مصر اپنی تہذیبی روایت کے اعتبار سے رسا ہوا ہے اور تہذیب روایات نسل در نسل ثقافت کی صورت میں منتقل ہوئی ہیں اور نئی نسل اس کی پاسداری کرتی ہے ہر چند کہ بزرگوں کو یہ شکوہ کیوں نہ ہو کہ نئی نسل روایات سے غافل ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ثقافتی طور واطوار مکمل معدوم ہو جائیں بلکہ وقت اور حالات کے ساتھ اس میں تغیر ضرور آتا ہے۔ مصر تاریخی طور پر زرخیز علاقہ رہا ہے اور جہاں خوشحالی ہوتی ہے وہاں مہمان

بوجھ نہیں بلکہ رحمت اور نعمت تصور کیے جاتے ہیں۔ اس طرح مصر میں بھی مہمان نوازی کا تصور انتہائی قدیم ہے۔ جس کے نقوش جدید دور میں بھی ملتے ہیں ان کی مہمانی نوازی کا اظہار محمد سعید نے یوں کیا ہے:

> سب نے مجھے دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور کچھ خواتین نے منہ پر ہاتھ رکھ کر وہی روایتی خیر مقدمی چیخیں بھی ماریں وہ لوگ بڑی محبت اور خلوص سے پاس آکر گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے اور اہلاً وسہلاً مرحبا کہتے۔[۱]

یہ ان لوگوں کے ملنے کا روایتی انداز ہے وہ جب کسی سے ملتے ہیں تو گرم جوشی کا اظہار مسکراہٹ اور قہقہ سے کرتے ہیں جو ان کی زندہ دلی اور خوش دلی کو عیاں کرتا ہے۔ چنانچہ انھیں مصری خاندان نے جب دعوت پر بلایا ان کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا اور چند لمحوں میں انھیں اپنے گھر کا فرد بنادیا اور پھر ان کے ساتھ سیاست، سیاحت اور دیگر موضوعات پر گفتگو میں محو ہو گئے اور جب کھانا تیار ہوا انھیں کھانے کی میز پر بلایا گیا۔ کھانے کی میز کی منظر کشی سفر نامہ نگار نے یوں پیش کی ہے:

> کھانا اتنی زیادہ مقدار میں تھا کہ اگر اتنے ہی لوگ اور بھی وہاں آجاتے تب بھی کچھ کمی نہ محسوس ہوتی۔ انگور کے پتوں میں لپٹے ہوئے قیمے کے بنئے ہوئے کچھ پکوان، اس کے علاوہ کئی طرح کے کباب، چاول اور دیگر مصری کھانے خوب صورت ترتیب سے میز پر سجائے گئے تھے۔[۲]

مہمان نوازی کا اعلیٰ ظرف یہ بھی ہوتا ہے کہ مہمان کا بہترین کھانوں کے ساتھ تواضع کی جائے اور طرح طرح کے کھانے سے مہمان نوازی کی جائے۔ ویسے بھی مہمان نوازی اعلیٰ اقوام کی اعلیٰ ظرفی کی عیاں کرتی ہے۔ ہم مسلمان ویسے بھی مہمان کو اللہ کی رحمت تصور کرتے ہیں، کھانا ویسے بھی اسی مالک کی دین ہوتی ہے لیکن اس سے مہمان نوازی کے اوصاف عیاں ہوتے ہیں۔ ذائقہ دار اور خوش اسلوبی سے ترتیب دینے سے اشیا مزید بڑھ جاتی ہیں۔ جب انھوں نے کھانا شروع کیا تب میزبان نے انھیں مزید کھانا دیا۔ جس کو وہ یوں رقم کرتے ہیں:

> روایہ کے شوہر نے زبردستی دو تین قسم کے کباب اور گوشت کے پارچوں کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں میری بڑی پلیٹ میں بھر دیں۔[۳]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصری لوگ مہمان نوازی میں بڑے فراخ دل ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ہیں۔ مشرقی اقوام کی طرح مصری بھی مہمان کی خدمت کرنے میں

پیش پیش ہوتے ہیں۔ انہیں کھانے کے بعد چائے اور کافی سے تواضع کی گئی، بلکہ دور چلنے لگے، الغرض مصری لوگوں میں قدیم روایات کی پاسداری اور مہمان نوازی جیسی خصوصیات اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہیں، جو ان کے تہذیبی اثرات کی نمائندگی کرتی ہیں اور وہ قومیں جو اعلیٰ سماجی اقدار رکھتی ہیں ان کا شمار بھی اعلیٰ قوموں میں ہوتا ہے۔ جس کی واضح مثال مصری لوگوں کی مہمان نوازی سے ملتی ہے۔

حنوط کے طریقے:

مصری لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح جسم سے نکل جاتی ہے اور جسم کی موت سے روح کی موت واقع نہیں ہوتی نیز روح کو جسم کی جب ضرورت ہوگی تب جسم کا ہونا لازمی ہے۔ اس ضرورت کے تحت انھوں نے جسم کو محفوظ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا عمومی طور پر حنوط میں بھی طبقات اور اجرت پر اقسام متعین کیے گئے تھے بادشاہوں اور فرعونوں کا حنوط اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں پر سفر نامہ نگاروں کی روشنی میں اس کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جب کوئی شخص یا بادشاہ مر جاتا تو سب سے پہلے اس کی اطلاع حنوط کے کاریگروں کو دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی تیاری اور لوازمات مکمل کریں۔ فرعون کے حوالے سے ایک گروہ مقبرے کی تیاری میں لگ جاتا تھا اور دوسرا گروہ حنوط اور مذہبی رسومات کی تیاری میں مصروف ہو جاتا تھا اور میت کو حنوط کرنے میں ۷۲ دن لگتے تھے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ:

> سب سے پہلے مردے کے بائیں پہلو میں شگاف لگا کر جسم سے نسبتاً جلد خراب ہونے والے نرم اجزاء جیسے معدہ، انتڑیاں، جگر، دل اور پھیپھڑے نکال لیے پھر ایک مخصوص آلے سے ناک کے ذریعے اس کے دماغ کو بھی ایک خاص ترکیب سے باہر کھینچ لیتے تھے۔ (۴)

مردہ جسم کے وہ اعضاء جن کی وجہ سے بدبو پیدا ہو سکتی تھی، ان کو پہلے جسم سے نکالا جاتا تھا اور دل کے علاوہ دیگر اعضاء کو غیر ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کو حنوط نہیں کیا جاتا تھا اور دل کو پھر اپنی جگہ پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اصل میں دل فہم و دانش اور عقل کو جوہر تصور کیا جاتا تھا اور پھر مردہ جسم کو حنوط کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حنوط کرنے کے دوران کاریگر یا پجاری خاص قسم کے ماسک لگاتے تھے جن پر جانوروں کی شکلیں بنی ہوتی تھیں تاکہ مردے کی حفاظت کرنے والا دیوتا ان کو پہچان نہ سکیں اور ان کا یہ عمل ان کی تباہی و بربادی کا سبب نہ بنے اور ایک بڑا پروہت چبوترے پر کھڑا بلند آواز میں منتر پڑھتا رہتا اور مردے کے جسم کو چیر پھاڑ کرنے والوں پر

مسلسل چھوٹی چھوٹی کنکریاں برساتا کہ ان کو لوگوں کے دیوتاؤں کے لیے نفرت کا اظہار دیا جائے جو لاش کو چیڑ پھاڑ اور بے حرمتی کر رہے ہیں۔ حنوط کا یہ طریقہ ان کے عقیدے کا حصہ ہوتا تھا:

> اس کے بعد وہ لاش کے اندرونی اجزا کو ایک خاص قسم کے نمک اور مصالحے وغیرہ لگا کر دھوتے اور پھر خشک ہونے کے لیے محفوظ جگہ پر رکھ دیتے تھے۔[۵]

ادھر جسم سے نکالے گئے اندرونی اعضا کو ایک خاص قسم کے نمک میں رکھا جاتا ہے اور مردے کا جسم جب خشک ہو جاتا ہے تب حنوط کا عمل شروع کیا جاتا ہے اور ادھر مقبرے کی تیاری بھی کی جاتی ہے تابوت اور اہرام کی تربیت شروع کر دی جاتی ہے۔ اس دوران عبادتیں بھی کی جاتی ہیں چنانچہ سفر نامہ نگار مزید لکھتا ہے کہ:

> پجاری لاش کو اچھی طرح ایک خاص نمک والے پانی سے مسلسل دھوتے، اس کے لیے وہ شراب بھی استعمال کرتے جو اینٹی بائیوٹیک کا کام کرتی تھی، پھر وہ کچھ اور کیمیاوی اجزاء استعمال کر کے لاش کو چالیس دنوں کے لیے ملحقہ کمرے میں سوکھنے کے لیے رکھ دیا کرتے ہیں۔[۶]

میت کو شراب اور دیگر کیمیاوی چیزوں سے اچھی طرح دھویا جاتا تھا۔ اس سے لاش کے اعضا، کھال اور گوشت محفوظ رہتا تھا۔ چنانچہ مردہ جسم جب سوکھ کر سکڑ جاتا تھا اور جسم پر جھریاں پڑ جاتی تھیں اس کو نرم کرنے کے لیے کئی روز تک مسلسل مختلف تیلوں کی مالش کی جاتی تھی۔ جس سے جسم ایک بار پھر نرم ہو جاتا تھا اور پھر جھریاں بھی غائب ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد وہ پیٹ اور دیگر خالی ہو جانے والی جگہوں کو بیروزے میں بھیگے ہوئے لکڑی کے ہرادے، گھاس پھوس اور کپڑے کی کترنوں سے بھر دیتے تاکہ وہ حصے ابرے اور بھرے ہوئے محصوص ہوں اور حقیقی نظر آئیں۔ اب ان کا آخری مرحلہ آتا تھا:

> آخری مرحلے میں اس پر موم اور تیل میں ڈوبی ہوئی سوتی پٹیوں کو باندھنا شروع کیا جاتا۔ پٹیوں کی کچھ پرتوں کو لپیٹنے کے بعد ان میں مرنے والے کا نام اور قبیلے میں اس کا مقام کے بارے میں لکھی ہوئی لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تختیاں رکھ دی جاتیں۔[۷]

عمومی طور پر ان پٹیوں کے ساتھ ہیرے اور جواہرات بھی رکھے جاتے تھے اور پھر پٹیوں کو گوند کے ساتھ مصالحہ ڈال کر جوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز آخر میں بھی مردے کا نام اور معاشرے میں اس کا منصب لکھا جاتا تھا۔ یہاں یہ حنوط کا عمل مکمل ہو جاتا تھا اور اب جسم سے نکالے گئے اجزا کو مرتبان میں رکھا جاتا تھا جو چار قسم کے

مرتبان ہوتے تھے۔ جن کے ڈھکن مختلف اشکال اور جانوروں کے چہروں سے مشابہ رکھتے تھے۔ جو ان چار دیوتاؤں سے مشابع تھے جو ان کے عقیدے کی عکاسی کرتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ ہر دیوتا مختلف اجزا کی حفاظت کرتا ہے اس لیے مختلف مرتبان میں الگ الگ اجزار کھتے تھے۔ایک مرتبان کا ڈھکن گیڈر کا ہوتا تھا۔ جس میں معدہ رکھا جاتا تھا۔ دوسرے مرتبان کا ڈھکن عقاب کی شکل کا ہوتا تھا۔ جس میں انتڑیوں کے اجزاء رکھے جاتے تھے۔ تیسرے مرتبان کا شکل بندر سے مشابہت رکھتا تھا اور اس میں مرتبان مردے کے پھیپھڑے رکھے جاتے تھے۔ نیز چوتھے مرتبان کی شکل انسانی چہرے سے مشابہت رکھتا تھا اس میں جگر رکھا جاتا تھا۔ان مرتبانوں میں تیل اور دیگر کیماوی اجزاء ڈال کر ڈھکن مستقل طور پر سیل کر دیا جاتا تھا اور یہ مرتبان تابوت کے سرہانے رکھتے جاتے تھے۔ حنوط کیا ہوا جسم پتھر، دھاتی، نفرتی یا طلائی تابوتوں میں رکھ کر بند کر دیا جاتا تھا۔ سفر نامہ نگار یعقوب نظامی نے بھی حنوط پر تفصیل سے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

> سب سے پہلے میت کو آپریشن تھیٹر جسے وہ IBU کہتے تھے میں لے جاتے جہاں میت کو یام کے خوشبو سے معطر شراب سے دھویا جاتا، پھر دریائے نیل کے پانی سے غسل دیا جاتا۔[۸]

انھوں نے دریائے نیل کے پانی کا ذکر بھی کیا ہے۔اس کی وجہ سے یہ بھی ہے کہ مصری دریائے نیل کو افضل سمجھتے تھے۔اس لیے نیل کے پانی کو مقدس سمجھنے کے آثار اور اسباب ملتے ہیں۔ جسم کو غسل دینے کے بعد اس کے اندرونی اجزاء نکالے جاتے تھے جس میں صرف دل کو رہنے دیا جاتا تھا اور پھر چمڑے کو ٹانکے لگا دیئے جاتے تھے تاکہ جسم ویسے ہی رہے اور پھر جسم سے نکالے گئے اجزا میں جگر، گردے، پھیپھڑے اور آنتنیاں شامل ہوتی تھیں انہیں بھی صاف کیا جاتا تھا۔ نیز وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

> لوہے کی ایک ناک کے ذریعے اندر ڈال کہ دماغ کی ہڈی توڑ کر مغز ناک کے ذریعے نکال لیا جاتا تھا۔[۹]

ناک کے ذریعے مغز کو نکالنے کا طریقہ انھوں نے بیان کیا ہے جس کو دیگر ماہرین نے بھی لکھا ہے جبکہ سعید جاوید نے نہیں لکھا ہے لہذا اب جسم کو حنوط کرنے کا عمل شروع ہوتا تھا۔ کچھ چیزیں انھوں نے صراحت سے بیان کی ہیں اور کچھ سعید جاوید نے تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں یعقوب نظامی مزید لکھتے ہیں:

جسم سے نکالے گئے اعضا کو الگ صاف کر کے انھیں بھی تیل اور روغنیات سے معطر کر کے خشک کرنے کے بعد ریشم کے کپڑوں میں بند کر کے دوبارہ جسم کے اندر رکھ دیئے جاتے تھے۔(۱۰)

موصوف لکھتے ہیں کہ ان اجزا کو جسم کے اندر واپس رکھا جاتا اور اس کے ساتھ سوتی کپڑا اور درختوں کے پتے بھر دیئے جاتے تھے جبکہ اس سے پہلے مرتبان کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے ممکن ہے کہ حنوط کا کوئی ایک طریقہ رائج نہ ہونے یا پھر دونوں کے ماخذ الگ الگ ہیں اس لیے جزئیات میں فرق آرہا ہے۔ اس کے بعد جسم پر ناٹرون جسے عام زبان میں خام شور کہتے ہیں، ڈال کر ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ اس سے جسم کی چربی اور دیگر رطوبت نکل جاتے تھی اور پھر چالیس دن کے بعد جسم کو دریائے نیل کے پانی سے دور کر کے جسم پر تیل اور دوسرے روغنیات لگا کر خشک ہونے کے لیے رکھ دیا جاتا تھا جسم جب خشک ہو جاتا تھا پھر پٹیوں کا مرحلہ شروع ہوتا تھا۔

پٹیاں باندھنے کا آغاز سر سے کیا جاتا تھا ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کو الگ الگ پٹیاں باندھی جاتی تھیں، بازو اور ٹانگوں کو بھی الگ الگ باندھ کر پھر جسم پر ایک چادر ڈال کر گوند کے ساتھ چپکا دی جاتی تھی۔(۱۱)

پٹیاں چڑھاتے وقت ہر تہہ پر الگ گوند لگائی جاتی تھی تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہیں اور اس دوران مذہبی پرویت مقدس کلمات پڑھتے رہتے تھے۔ نیز جب میت کی حنوط مکمل ہو جاتی تھی۔ مصری لوگوں کا عقیدہ تھا کہ دیوتا ازریس میت کی حفاظت بھی کرتا ہے اور حساب کتاب بھی کرتا ہے۔ مردے کے ساتھ اس کا اعمال نامہ بھی ایک تختی پر لکھا جاتا تھا۔ بادشاہوں اور فراعنہ کے لیے بڑے تابوت اور مقبروں کے ساتھ سونے کا ماسک بھی تیار کیا جاتا تھا جو ان کے چہرے پر لگایا جاتا تھا۔ لاش کے ساتھ کھانے پینے کی اشیا اور برتن بھی رکھے جاتے تھے جو کھدائی سے دریافت ہوئے ہیں۔ سفر نامہ نگار ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے حنوط کا طریقہ کار ہیر ڈوٹس کی مدد سے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

ہیر ڈوٹس کے مطابق حنوط کاری کرتے وقت پہلے ایک لوہے کے آنکڑے کے ساتھ مغز انسانی کو نتھنوں کے راستے باہر نکالا جاتا، اس کے بعد کھجوری شراب سے پیٹ کو دھو کر عطر چھڑکا جاتا۔ امتلاس، لویان اور دیگر ادویات نما عطریات سے پیٹ بھرا جاتا اور دوبارہ سی جاتا، اس کے بعد جسم کو خام شورے میں دو ماہ دس دن تک ڈبوئے رکھنے کے بعد مومی کپڑے میں لپیٹ کر اس کپڑے کے اوپر گوند لگایا جاتا، پھر جسم کو قیمتی

تابوتوں میں بند کر اہراموں کے اندر بنے کمروں میں رکھ کر ساتھ قیمتی اشیا چھوڑ آتے
(۱۲)۔

تاہم موت پر قوی یقین ہونے کے بعد بھی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ابدی حیات کا خواہش مند ہے کہ ایسی زندگی ہو جو کبھی ختم نہ ہو۔ شاید ایسی خواہش نے ایک نئی مرنے کے بعد زندگی کے تصور کو جنم دیا۔ اہل مصر بھی ابدی حیات کے خواہاں تھے اور اپنے جسم سے محبت کرتے تھے اس لیے انھوں مذہبی عقائد کے ساتھ نفسیاتی طور پر بھی جسم کو محفوظ کرنے کا طریقہ دریافت کیا جسے حنوط کاری کہتے ہیں۔ نیز یہ انسانی خواہش اب بھی طریقے تدریس کر رہی ہے کہ وہ ابدی حیات حاصل کر لے۔ دیگر سفر نامہ نگاروں نے حنوط کاری کے طریقہ پیش نہیں کیے ہیں بلکہ انھوں نے انتہائی اختصار سے کام لیا ہے۔

عہد فراعنہ کے مقبرے اور جو لاشیں ملی ہیں وہ انسانی خواہش کے علاوہ قرآن مجید کی صداقت اور سچائی کی بھی عکاس ہیں لہذا رہتی دنیا تک لوگ فرعون کی ممی سے عبرت حاصل کرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہے گے۔

تعمیرات:

فنِ تعمیر کی داستان نوع انسان کے تمدن کی داستان ہے تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح تک بڑی بستیوں اور شہروں کی ابتداء ہو چکی تھی اور دنیا کی تمام تہذیب و تمدن دریا اور ندیوں کے کنارے پر وجود میں آئی ہیں اور سب سے پہلے فنی ترقی وادی نیل کی وجہ سے ہوئی اس کی وجوہات سیلاب اور پتھروں کی بہتات بھی تھا جس وجہ سے یہاں تعمیرات کی بنیاد فراہم ہوئیں۔ مصر کے اہرام اور مقبرے انہی پتھروں سے تعمیر کیے گئے ہیں جو دنیا کے عجوبے تصور کیے جاتے ہیں۔ ان بھاری پتھروں کو اٹھانے کے لیے مہارت اور فن انجینئرنگ کی بھی مہارت درکار تھی۔ چنانچہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں لوگ فنِ تعمیرات پر مہارت رکھتے تھے اور پتھروں کو تراشنے کا فن بھی رکھتے تھے۔ سب سے بڑے ہرم کی تعمیر میں تقریباً دو ٹن سے زیادہ وزنی کم و بیش بیس لاکھ پتھروں کا استعمال ہوا ہو گا اور ان کی تراش خراش اتنی عمدہ ہے کہ ان کے درمیان سے چھری یا نوک دار آلے کے گھسنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ قدیم مصر کی تعمیرات میں اہرام کے علاوہ چٹانوں میں تراشے گئے مندر، مقبرے اور اونچے پینل نما مینار بھی فنِ تعمیرات کی اعلیٰ مثال ہیں۔ ان عمارتوں کی تعمیر کی نمایاں خصوصیت ہے ان کا کھڑک پن اور جسامت، تعمیر جیسے جیسے اوپر کی جانب اٹھتی ہے وہ پتلی اور نوک دار ہوتی جاتی ہے۔ مندر اور مقبروں کی چھتیں سپاٹ اور پتھروں کے بڑے بڑے ستونوں پر مشتمل ہیں۔ مصریوں کو انجینئرنگ کا علم تھا۔

اس لیے سنڈول اور بڑے جسامت کے لگا تیں ہیں اور پھر ان پر دیوتاؤں، جانوروں اور انسانوں کی شکلیں بھی بڑی تعداد میں کندہ کی ہیں۔ مصری فن کار پتھروں کو کاٹنے، ان پر متصل کرنے اور سنگ تراشی کے ماہر تھے۔ وہ پتھروں کے بلاکوں کو ٹھوس چٹانوں سے کاٹ کر منتقل کرنے میں کمال رکھتے تھے۔

مصری تہذیب سے عام گھر وغیر ہ نہیں ملے ہیں۔ جیسے موہنجو سے ملے ہیں۔ مصری تعمیرات میں مقبرے، مندر اور ممیاں اور مندر کے مقبروں پر تراشی ہوئی مصور ملی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں پر سب سے زیادہ تعمیر کی توجہ عبادت گاہوں، مقبروں اور مجسموں پر دی گئی ان مقبروں میں اہرام بھی شامل ہیں اور ان اہرام کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ان اہرام کی تعمیر کے لیے پتھر کو کیسے لایا جاتا تھا اس پر سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

> مزدور جنوبی مصر کے علاقے اسوان کے پہاڑوں سے پتھر کاٹ کاٹ کر نکالتے اور پھر دریائے نیل میں کشتیوں کے ذریعے ایک ہزار کلو میٹر کا سفر طے کرتے ہوئے گیزہ لاتے تھے، بھاری پتھروں کے نیچے گول گول لکڑیاں رکھ کر پتھر کو رسوں سے باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔ (۱۳)

تاہم یہ پتھر یہاں لائے جاتے تھے اور پھر ان سے مقبرے تعمیر کیے جاتے تھے اور اہرام بنائے جاتے تھے ہر چند کہ اس کام میں انسانی محنت و مشقت بہت زیادہ استعمال ہوتی تھی اور کئی مزدور یا غلام ان پتھروں کے نیچے آ کر اجل کا شکار بھی ہو جاتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ کام شاید دن رات جاری رہتا ہو گا تبھی تو یہ مکمل ہو جاتے ہوں گے چنانچہ گنیزہ کے اہرام کے لیے پتھر قاہرہ شہر کی سب سے اونچی پہاڑی مقطیب سے بھی نکالے جاتے تھے۔ اہرام کی شکل اوپر جاتے ہوئے مخروطی بن جاتے ہیں اور انتہائی بھاری پتھروں کو کاٹ کر بنائے جاتے تھے۔ اہرام کے علاوہ مصری تعمیرات میں سنگ تراشی اور بت تراشی ملتی ہے۔ جن میں ابوالہول کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

ابوالہول کا مجسمہ ایک چٹان کو کاٹ کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ جیسے کوئی شیر ہے جو اپنے پیچھے دریاؤں سمیٹے آرام سے بیٹھا ہے اور اگلے دنوں پاؤں آگے پھیلائے ہوئے ہے چنانچہ سر اوپر یوں اٹھا ہوا ہے کہ گویا کوئی پاسبان ہو شیر کے دھڑے پر انسانی سر ہے۔ اس حوالے سے ماہرین کا خیال ہے کہ ابوالہول کو چہرہ کافری بادشاہ کا چہرہ ہے اور سر کے اوپر جس طرح فراعنہ بادشاہ تاج پہنتے تھے۔ اسی نمونے کا تاج رکھا ہوا ہے۔ ابوالہول، عربی

زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دہشت کا باپ ہے۔ امکان غالب ہے کہ قدیم فراعنہ عہد میں اسے تراش کر عبادت کے قابل بنایا گیا۔ چنانچہ سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

> ابوالہول کو قریب سے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پہلے یہ پہاڑی تھی جسے کاریگروں نے کاٹ اور تراش کر ۶۶ فٹ اونچا مجسمہ بنایا جس کا چہرہ بیس فٹ چوڑا ہے۔[۱۴]

یہ آج سے کوئی ساڑھے چار ہزار سال پہلے مصری کاریگروں نے بنایا تھا، گو کہ اس مجسمے سے فراعنہ کی مذہبی عقیدت کو بھی عمل دخل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ابوالہول دریائے نیل کو جب تک دیکھتا رہے گا دریائے نیل یوں ہی روانی سے بہتا رہے گا۔ اس کے علاوہ کرناک کا مندر بھی تعمیر کے اعتبار سے مصری کاریگروں کی عمدہ مثال ہے۔ ہر چند کہ اب اس مندر کے تین حصے مخدوش ہو چکے ہیں لیکن جو حصہ لوگوں کے لیے کھولا گیا ہے وہ بھی تعمیر کا شاہکار نمونہ ہے جس میں بڑے بڑے ستونوں کی مدد سے ہال تعمیر کیا گیا ہے۔ ملکہ نفریتی اور بادشاہ رعمیس ثانی کے مجسمے بھی انسان کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ اتنے اونچے اور دیو ہیکل مجسمے وہ بھی آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل تعمیر کیے گئے۔ اس وقت نہ اتنے جدید آلات تھے اور نہ ہی مشینری تھی، یہ کاریگروں کی مہارت اور فن کا نادر نمونہ ہیں۔

مصری تعمیرات میں دوسری اہم شے مسجدیں ہیں جو مسلمانوں کے فتح کے بعد تعمیر کی گئی ہیں۔ جن میں مسجد قبا بھی شامل ہے یہ مسجد حضرت عمرو ابن العاص نے تعمیر کروائی تھی۔ اس وقت چھوٹی تھی لیکن اب بہت بڑی اور وسیع بنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مسجدِ حسین، مسجد علی بھی تعمیرات کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

> مصری نہ صرف اچھے عبادت گزار ہیں بلکہ عمارت گر بھی ہیں میں نے کسی عبادت خانے کی عمارت بے ڈول، بے مزہ اور غیر متوازن نہیں دیکھی۔[۱۵]

الغرض قدیم مصر نے اہرام، مقبرے اور مجسمے تعمیر کرنے میں مہارت رکھی ہوئی تھی جس کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ جوق در جوق آتے ہیں اور ان کے فن کو داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔ اسی طرح جدید مصر میں مساجد کی تعمیرات نے بھی ایک دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے۔ جہاں بیک وقت جدید اور قدیم کا امتزاج ملتا ہے۔ مصری کاریگری کے ساتھ عرب اور ایرانی تعمیر بھی ملتی ہے۔ ہر چند کہ نئی عمارت یورپ سے متاثر ملتی ہیں۔ لیکن دیگر مقامات خالص مصری تہذیب کی آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں۔ خواہ وہ فرعون کا سفید محل

ہو یا پھر آغا شاہ خان کا محل ہو، اپنی تعمیر کے حوالے سے انفرادیت اور یگانگت رکھتے ہیں اور ایک دنیا کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

مصری ممیاں:

زمانہ قدیم میں دنیا کے مختلف خطے اور تہذیبوں میں اہم شخصیات یا دیوتا کے مردہ جسم کو محفوظ رکھنے کا رواج ملتا ہے۔ مردہ جسم کو محفوظ کرنے کے پیچھے عقائد کا کلیدی عمل دخل رہا ہے جبکہ ہر فرد کو اس چیز کا ادراک ہے کہ موت ایک دائمی حقیقت ہے اور یہ جسم بھی فنا ہو جائے گا۔ لیکن پھر دنیا کے مختلف علاقوں کے مختلف عقائد کے لوگ اپنے بادشاہوں کی لاش کو محفوظ رکھنے کے رواج کو اپناتے رہے ہیں مصر کے علاوہ دنیا کے الگ الگ خطوں میں بھی لوگ لاشوں کو محفوظ کرتے رہے ہیں۔

ممی اصل میں فارسی لفظ ہے جو حنوط کی گئی لاش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کو مومیاتی بھی کہتے ہیں۔ ہر خطے اور قوم میں لاش کو ممی بنانے کے طریقے مختلف رہے ہیں ایک طریقہ قدرتی یا فطرتی کہہ سکتے ہیں یعنی وہ لاشیں جو قدرتی طور پر از خود محفوظ ہو گئیں ہیں۔ مثلاً اینڈیز پربت پر ملی ان بچوں کی لاشیں جنھیں بیسویں صدیں میں قربان کر دیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر ممی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان ممیوں کی خاصیت یہ بھی ہے کہ ان کے جسم میں اب بھی خون موجود ہے۔ کیونکہ برفیلی ہواؤں کی وجہ سے بچوں کے جسم محفوظ رہے۔ اس کے علاوہ سوپ لیڈی کو بھی قدرتی ممی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خاتون کی ممی ہے جس کی موت سو سال قبل واقع ہوئی تھی جس کو فلاڈیلفیا کے قبرستان سے برآمد کیا گیا چنانچہ کسی وجہ سے سوپ لیڈی کی لاش کو اس کی قبر سے نکال کر دوسری قبر میں منتقل کیا جا رہا تھا جہاں وہ ممی بن چکی تھی دراصل قبر کی مٹی کے درجہ حرارت کی مطابقت اور نمی کی مناسب مقدار کے سبب لاش محفوظ رہی جسے اب ممی کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ ممی قدرتی طریقہ ہے جو صرف قدرت کے اختیار میں ہے۔ کبھی کبھار ہم بھی اپنے بزرگوں سے سنتے تھے کہ فلاں شخص کو بے گناہ قتل کیا گیا اور کسی وجہ سے خواہ وہ موسمی تبدیلی ہو، بارش یا سیلاب کی وجہ سے قبر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ کفن بھی میلا نہیں تھا یہ قدرت کے کرشمات ہیں۔ اس کو ممی کہنا قطعی درست نہیں ہے۔ ممیاں مصنوعی طور پر بنائی جاتی ہیں جس کے مختلف طریقے رائج ہیں۔

تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح میں چلی چنکو کے لوگ اپنے بادشاہوں یا مذہبی اہمیت کے حامل افراد کی ممی بنا کر جسم کو محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ ان کی ممی بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ لاش سے پہلے سارا گوشت الگ کر دیتے تھے اور پھر اس میں مخصوص قسم کی مٹی کو ملا کر دوبارہ گنگال پر لیپ کی طرح منڈھ دیا جاتا تھا اور پہچان

کے لیے ان ممیوں پر نشانات بنائے جاتے تھے کیونکہ لیپ کرنے کے بعد اعضا کا تناسب اور چہرے میں بہت زیادہ فرق آجاتا تھا اور کہیں تو سوکھے اجسام پر مردے کی تصویر پینٹ کر دی جاتی تھی۔ تاہم چین میں لاشوں کو محفوظ کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ لاش کے اعضا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کیے بغیر اس پر فارمیل ڈی ہائڈ کے گھول کا لیپ چڑھا دیا جاتا تھا اور یہ طریقہ پانچ سو سال قبل تک رائج تھا۔ جبکہ تیسرا طریقہ مصری لوگوں کا تھا جو بہت زیادہ مشہور و مقبول بھی تھا جس کا ذکر ہم پہلے تفصیل سے کر چکے ہیں۔

مصری لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد انہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور روح کے لیے جسم کا ہونا ناگزیر ہے اس لیے یہاں کے لوگ جسم کو محفوظ کرنے کے لیے حنوط کا طریقہ اپناتے تھے جس سے جسم محفوظ رہتا تھا اور انہی حنوط کردہ اجسام کو ممی کہا جاتا ہے۔ مصر میں ممی بنانے کا آغاز تقریباً چوتھی راج شاہی سے ہوا جو کہ ۳۶۰۰ قبل مسیح میں موجود تھا۔ ان ممیوں کو اہرام میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا۔ ابھی نصف صدی قبل مغربی مصر کے ریگستان میں محفوظ شدہ لاشوں کی دس ہزار ممیاں ایک ہی جگہ سے دریافت ہوئی ہیں اور اس جگہ کا نام ممیوں کی وادی رکھا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ ممیاں تین سو تیس قبل مسیح اور چار سو عیسوی کے درمیان کی ہیں۔ چنانچہ ہمارے سفر نامہ نگاروں نے مصری ممیاں دیکھی ہیں جو بیان کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ :

> دروازے کے ساتھ دائیں طرف رکھی ہوئی پہلی میت فراعنہ بادشاہ سقن رع تاعال ثانی کی تھی۔ دراز قد نقش و نگار بسندر، محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کسی مرد کی نہیں بلکہ افریقی عورت کی میت ہے اس کے سفید دانت چمکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔[۱۶]

مصری حکومت نے عہدِ فراعنہ کی ممیاں عجائب گھر میں رکھی ہیں جو قائرہ میں واقع ہے یہاں پر تقریباً گیارہ بادشاہوں کی ممیاں ہیں جو سیاحوں کے لیے رکھی گئی ہیں۔ یہاں پر ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ لوگ قبروں سے ممیاں نکال کر گلی کوچوں میں فروخت کر رہے تھے تاریخ میں قوموں پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ اپنی تاریخی میراث کو دو پیسوں کے عوض فروخت کر دیتے ہیں لیکن یعقوب نظامی نے جو دانت بتائے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے لاش ابھی بھی سلامت تھی اور اس کے دانت بھی چمک رہے ہیں۔ سفر نامہ نگار مزید لکھتے ہیں کہ :

> ساتھ آمن ہوتب اول کی میت ہے جس پر پھول رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس کی بیوی نفریتی تھی۔ آمناتپ کی میت کے ساتھ ٹوتھموس اول، دوم، سوم کی میتیں ہیں۔ نوتموس مسکراتا ہوا نظر آرہا ہے جیسے اس کی موت پر سکون حالت میں ہوئی۔ ان سب کے چمکتے ہوئے سفید دانت ابھی تک محفوظ ہیں۔۱۷

آمن تب اول کی بیوی نفریتی حسن کی ملکہ تھی جس کا حکم بادشاہوں پر بھی چلتا تھا اور اسی بادشاہ نے اپنے آباؤاجداد کے مذہب کو خیر آباد کہہ دیا تھا اور متعدد دیوتاؤں کے بجائے واحد دیوتا کی پوجا شروع کی تھی اور اپنا دارالحکومت بھی عمرانہ نامی شہر میں قائم کیا تھا۔ نیز مصریوں کو ممیاں تیار کرنے پر اس قدر مہارت تھی کہ آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی سیاح یہ اندازہ لگا رہا ہے کہ فلاں کی موت سکون کی حالت میں ہوئی ہو گی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آ رہی ہے۔ وہ سخت اذیت میں مبتلا تھا چنانچہ انھوں نے ہر ممی کی پیکر کشی کی ہے لیکن جو تصویر کشی اور پیکر کشی عمیس دوم کی پیش کی ہے وہ انتہائی حیرت انگیز ہے وہ لکھتے ہیں کہ :

> پہلی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بڑے عذاب میں مبتلا ہو کر مرا۔ اس کی کھینچی ہوئی گردن سامنے نظر آ رہی ہے، گردن کی نلیاں واضح نظر آ رہی ہیں، سر کے بال درمیان سے غائب اور دونوں طرف کانوں کے اوپر موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنجا تھا۔ منہ زیادہ کھلا ہونے کی بنا میت حنوط کرنے والوں نے منہ میں کوئی چیز ٹھونس کر اسے بند کرنے کی کوشش کی تھی، دائیں طرف کے دانت نظر آ رہے ہیں، اس کے سر کے بال، ہاتھ اور پاؤں کے ناخن بھی موجود ہیں۔ قد چھ فٹ کا تھا جسم چھریرا تھا۔ (۱۸)

سفر نامہ نگار نے جس صراحت اور جامعیت کے ساتھ حلیہ پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑے غور سے اس ممی کا معائینہ اور مشاہدہ کیا ہے اور جزئیات سے ہر ایک پہلو کو بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ رعمیس دوم نے ہی اپنے لیے فرعون کا خطاب منتخب کیا تھا، اس سے پہلے صرف شاہی خاندان کا لقب ہوا کرتا تھا اور اسی فرعون کے گھر میں اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی تھی اور ان کے بیٹے منفتاح نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا کیا تھا اور سمندر میں ڈوب کر غرق ہو گئے تھے۔ چنانچہ مصری ممیاں اپنی حنوط کاری کی وجہ سے آج بھی دنیا کی توجہ کا مرکز ہیں۔ القصر کے شاہی قبرستانوں سے نکالی گئی ممیاں قاہرہ کے عجائب گھر میں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ ان ممیوں کو دیکھ کر سفر نامہ نگار ڈاکٹر الطاف نے جو جزئیات بیان کی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

> دوسری منزل کے مرکزی برآمدے میں میاں بیوی فراعین یوپا اور تو ویا کی لاشیں رکھی گئی تھیں جن کے سر کے بال اور ناک ہونٹوں کے کنارے آج بھی سلامت

تھے۔ صرف شوہر صاحب کے دائیں پاؤں کی بڑی انگلی سے ایک دو انچ کے برابر
گوشت اتر چکا تھا اور دونوں میاں بیوی قد کاٹھ میں برابر تھے۔[۱۹]

ڈاکٹر صاحب نے مصری عجائب گھر میں دیگر ممیاں بھی دیکھی ہیں۔ لیکن جزئیات کے ساتھ مذکورہ جوڑے کو بیان کیا ہے جبکہ رعمیس دوم کی ممی کو دیکھنے کے بعد انھوں نے اس عہد کی ترقی اور اقدامات کو قلمبند کیا ہے۔ ہر چند کہ مصر میں ممیاں بنانے کا عام رواج رائج تھا بلکہ اس کو عقیدے کا درجہ حاصل تھا چنانچہ سفر نامہ نگار نے دیگر ممیوں کے ساتھ رعمیس ثانی کی منظر کشی اس طرح بیان کی ہے:

وہ عام سے قد کاٹھ کا ایک معمولی انسان تھا، پہلی نظر میں وہ ایک عام سا گنجا بابا ہی لگتا تھا، اس کے دانت کچھ کچھ باہر نکلے ہوئے تھے اور کنپٹیوں اور سر کے پیچھے والے حصے پر چند سرخ اور سنہری بال ابھی تک موجود تھے، تاہم چاروں طرف پڑے ہوئے رنگ برنگے نوادرات اور تاریخی کیتے چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ واقعی وہ اپنے وقت کا عظیم الشان بادشاہ ہی تھا۔[۲۰]

اس سفر نامہ نگار نے مذکورہ ممی کو اپنے محلے کے کھٹے میٹھے امرود فروخت کرنے والے بابا عنائیتا سے مشابہت دے دی اور پھر اس کا حلیہ بیان کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ مصر اہرام کے ساتھ ممیوں کی وجہ سے مشہور ہے اور قدیم مصر میں بادشاہوں، فرعونوں، ملکاؤں کے علاوہ عام لوگوں کی بھی ممیاں بنائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جانوروں کی ممیاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ جن میں ہرن، شیر، گیدڑ، بلی، کتا، عقاب اور دیگر جانور شامل ہیں اور ان کی ممیاں بھی عجائب گھر میں رکھی گئی ہیں۔

فراعنہ کا مذہب:

مختلف عقائد کا مجموعہ مذہب کے تصور کو جنم دیتا ہے یعنی زندگی اور موت کے متعلق نقطہ نظر، تخلیق کائنات کیونکر ہوئی اور انسان کا وجود کس شے سے عبارت ہے۔ یہ تمام نظریات ہی مذہب کی اساس بننے میں معاونت کرتے ہیں۔ اگر اس تناظر میں عہد فراعنہ کے مذہب کو پڑھا جائے تب یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا مذہب بت پرستی تھی۔ بت پرستی دنیا کا سب سے قدیم مذہب ہے جو اساطیری دیومالائی کرداروں پر مشتمل ہے اور فراعنہ کا مذہب بھی بت پرستی تھا اور ان کے یہاں دیومالائی کرداروں کی کثرت ملتی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ موت ہی کی بدولت زندگی کی تمام طاقتیں نمودار ہوتی ہیں اور معاشرے کو زرخیز اور شاداب کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں انسانوں اور جانوروں کی قربانی کی جاتی تھی اور اس ماورا اعظم کے اسی تصور کو پیش کرتی ہے۔

ان مذاہب میں بیج کو ایک ایسی علامت کے طور پر مانا جاتا تھا جو موت اور زندگی کے کبھی نہ ختم ہونے والے تصور اور سلسلے کی عکاسی کرتا ہے۔ بیج زمین میں دفن ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور پھر اس سے نئی زندگیاں جنم لیتی ہیں۔ مصری بھی موت کو یوں ہی سمجھتے تھے کہ اس کے بعد پھر زندہ ہونا ہے اور ابدی زندگی بسر کرنی ہے اسی غرض سے مردے کو حنوط بھی کیا جاتا تھا اور اس کی قبر میں کھانے پینے کی اشیاء، کپڑے، ہیرے جواہرات اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء دفن کی جاتی تھیں۔

مصر کے کھنڈرات سے ان گنت دیوتا کے مجسمے بھی ملے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے یہاں دیوتاؤں کی پوجا اور عبادت کی جاتی تھی اور تھبیس کے میدان میں پتھر کی تراشی ہوئی مورتیوں کی ایک لمبی صف ہے۔ نیز کے دیوتا بڑے قد و قامت کے تھے اور ان کی قوی ہیکل دیوتاؤں کے عظیم الشان خط و خال سے نہایت ہی سنجیدگی اور متانت عیاں ہوتی تھی جن سے بنانے والوں کی عقیدت اور احترام بھی دکھائی دیتا ہے۔ بعض دیوتاؤں کے ساتھ دیویاں بھی تھیں جن کی پوجا کی جاتی تھی اور ان کے مجسمے بھی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بنائے گئے تھے۔ ایک بڑی بھاری مورت کا سر جو کہ لندن کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے اسے نیگ ممنون کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ قدیم مصر میں مختلف دیوی اور دیوتاؤں کی عبادت ہوتی تھی ان کے یہاں ہر عمل اور کام کے لیے الگ دیوی اور دیوتا مختص تھے۔ جن میں سے بنیادی دیوتا اور دیوی کا ذکر یہاں کیا جائے گا کہ جن کی عبادت گاہیں اور مجسمے دریافت ہوئے ہیں۔ دراصل ان دیوتاؤں کا تصور حالات، جغرافیائی حدود اور مادی نعمتوں سے بھی ہے۔ چونکہ مصری لوگوں نے سورج کی بدولت فصلوں کو پکتے دیکھا اس لیے انھوں نے پوجا شروع کر دی۔

"را" سورج دیوتا:

یہ فراعنہ کا عظیم ترین دیوتا سورج تھا جو دیوتاؤں کا دیوتا تصور کیا جاتا تھا اسے تخلیق کار اور آخرت کا دیوتا مانا جاتا تھا اور مصر کے تمام فرعونوں نے اس کی پوجا کی اور خود کو اس کی اولاد قرار دیا۔ مصری لوگوں کا عقیدہ تھا کہ زندگی میں تمام تخلیق اور اناج اسی دیوتا کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی ناراضگی سے فصل سوکھ جاتی ہے اور قحط سالی آجاتی ہے۔ اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ اس نے دنیا کو پیدا کیا ہے اور اس دیوتا کی پوجا ہیلو پولس شہر میں کی جاتی تھی۔

دیوتااوریس:

اس دیوتا کو بعض جگہ ازیرس بھی لکھا گیا ہے اس دیوتا کو دریائے نیل کا مظہر تصور کیا جاتا تھا اور بعد ازاں اس کو آخرت میں حساب کتاب لینے والا اور مردوں کا دیوتا مانا جانے لگا اسی دیوتا کو اس کے بھائی دیوتا ست نے دھوکے سے قتل کیا تھا اور اس کے بیٹے ہورس نے اپنے والد از ہریس کا بدلہ لیا اس دیوتا نے لگ بھگ ہزار سال کے بعد پھر جنم لیا اور اس کی بیوی دیوی ازریس نے اس کے ٹکڑوں کو جمع کر کے زندہ کیا تھا۔ اس دیوتا کی تصویر مرنے والے کے تابوت پر بھی بنائی جاتی تھی اور یہی دیوتا گناہوں کا حساب لیتا تھا نیز اس دیوتا کے تہوار بھی منائے جاتے تھے۔ فرعونوں نے اس دیوتا کی پوجا لازم قرار دی تھی۔

دیوی ازیس:

یہ دیوی دیوتا ازریس کی بیوی اور بہن تھی جبکہ دیوتا ہورس کی ماں تھی اور یہ ایک حاسد دیوی تصور کی جاتی تھی کہ اس دیوی کو یہ بات کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی کہ اس کی رائبہ کسی سے شادی کرے۔ اس لیے اس کو حاسد دیوی بھی کہتے تھے جبکہ اسے کئی روپ والی اور مادرِ مقدس اور دیوتا کی ماں مانا جاتا تھا۔ اس کے مجسمے الگ الگ روپ میں لگتے ہیں۔ ایک مجسمہ یوں بنا ہوا ملتا ہے کہ یہ بیٹھی ہوئی ہیں اور بچے کو دودھ پلا رہی ہیں اور بچے کے پستان سے دودھ کی ران ٹپک رہی ہے۔ ایک مورتی میں اسے حسین عورت دکھایا جاتا ہے اور دوسرے روپ میں اس کا سر گائے کا ہے اور جسم عورت کا ہے۔ نیز اس دیوی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور سسٹرم نامی ساز بھی اسی دیوی سے منسوب کیا جاتا ہے جس کی آواز بڑی عارفانہ اور درد بھری ہے اور اسی دیوی کو محبت کی دیوی بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

دیوتاہورس

یہ عظیم دیوتا ازریس اور دیوی ازیس کا بیٹا تھا جس نے دیوتا ست کو قتل کر کے اپنے باپ کا بدلہ لیا تھا اس لیے اس کو باپ کا بدلہ لینے والا دیوتا بھی کہتے تھے اسے کبھی بچہ اور کہیں اس کا سر عقاب کا بنایا جاتا تھا۔ اسے زندہ دیوتا تصور کرتے تھے اس دیوتا کو بادشاہت، پیداوار اور طب کا دیوتا تصور کیا جاتا تھا اور اسی کی مناسبت فرعون بادشاہ اپنے تاج میں عقاب کی آنکھ شامل کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ عقاب کی آنکھ انہیں اپنے دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

دیوتاتت:

فراعنہ مذاہب میں اس دیوتا کو بدی، برائی اور شیطانیت کا دیوتا تصور کیا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ طوفان اور سیلاب بھی یہی لاتا تھا، اس دیوتا نے تخت کی لالچ میں اپنے بھائی دیوتا ازریس کو دھوکہ دے کر قتل کر کے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر مختلف جگہ پر دفنا دیئے تھے اور اسی دیوتا کو دیوتا ہوریس نے قتل کر کے اپنے باپ کا بدلہ لیا تھا جس کی وجہ سے یہ دیوتا انتہائی بدنام اور برا سمجھا جاتا تھا۔ بعض جگہ پر اس دیوتا کو ساتت اور ساتھت بھی لکھا گیا ہے۔

دیوتا آمن:

قدیم مصری لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ دیوتا سب سے عظیم تر ہے جس نے تمام دیوتاؤں اور دیویوں کو پیدا کیا یہ ازلی اور ابدی، کامل، قادر مطلق اور تمام شے کا خلاق ہے۔ اس کی تصویر ایک ایسے انسان سے مشابہت رکھتی تھی جس کے سر پر سینگ ہوں، اسے خود مختاری کا دیوتا بھی مانا جاتا تھا۔ اس کی عبادت مصر کے علاوہ لیبیا اور نوبیا میں بھی کی جاتی تھی۔ اس کا مجسمہ تھیبس میں دریافت ہوا جسے تین دیوتاؤں کا مجموعہ ثالوت بھی کہتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مجسمہ آمن دیوتا کا تھا۔ سورج دیوتا کے ساتھ بھی اس کا نام لیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کو آمن را بھی پکارتے تھے۔ دیوی مت (Mut) اس کی بیوی تھی۔ اس دیوتا کو بعض کتابوں میں ایمن بھی لکھا گیا ہے۔

دیوی مَت:

اس دیوی کو موت اور ممتا کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا، اس کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دیوی تقدیر پر قادر اور قسمت پر دسترس رکھتی تھی اس کی عبادت مصر کے علاوہ سوڈان کے کئی علاقوں میں بھی کی جاتی تھی۔ آغاز میں اس دیوی کے لیے کہا جاتا تھا کہ یہ تمام مظہر پر دسترس رکھتی ہے اور خود بھی تخلیق کرتی ہیں۔ اس کی عبادت مصر کے شہر تھیبس میں کثرت سے کی جاتی تھی اور فرعون اسی کی نسبت سے اپنی حاکمیت اور طاقت کا اظہار کرتے تھے جبکہ فرعون بت شی پست نے خود کو دیوی مت کی اولاد قرار دے کر حکومت کی تھی اور انہوں نے بڑی سطح پر دیوی مت کی عبادت اور پوجا کے احکامات جاری کیے تھے۔ اس کو تصویروں میں جوان اور حسین عورت کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا جس کو نیلے اور لال رنگ کا لباس ملبوس ہوتا تھا اور اس کے سر پر مصر کے دونوں تاج لال اور سفید بنائے جاتے تھے۔ اسے جانوروں، شیر، گائے، سانپ اور بلی کے ہمراہ کھڑے بھی

دکھایا جاتا تھا۔ جو اس کی بہادری اور ممتا کی علامت ہوتی تھی۔ اس دیوی کی پوجا "آمن" دیوتا کی طرح تھیبس شہر میں بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی۔

دیوی مات:

قدیم مصری لوگ اس دیوی کو اس دنیا اور آخرت کی دیوی تسلیم کرنے کے ساتھ ناپ تول کا نظام، موسم اور ستاروں کی گردش، کائنات میں انتشار اور فسادات کو روکنے والی دیوی مانتے تھے اور اسے سچائی اور صداقت، برابری اور قانون کی حکمرانی کی نگرانی کرنے والی دیوی قرار دیتے تھے۔ مصر کے فراعنہ عدل وانصاف کرتے وقت اس کا نام لے کر کرتے تھے۔ اس دیوی کو سورج دیوتا "را" کی بیٹی کہتے تھے اور اسی کی نقش جوان عورت کی صورت بنایا جاتا تھا۔

دیوی نفتیس:

یہ دیوی نت دیوتا کی بیٹی، خدائے شہرست کی بیوی ہیں، اس دیوی کے ذمے سورج ابھرنا، غروب کرنا اور اندھیرا کرنا ہوتا تھا اور اس کے علاوہ صحت، بچوں کی پیدائش کے وقت ان کی حفاظت کرنے والی دیوی تھی اس کے علاوہ عبادت گھروں کی حفاظت بھی یہی دیوی کرتی تھی۔ اس کی ایک تصویر بھی دکھائی گئی ہے جس میں دیوتا اریس کی لاش پر دیوی ازیس کے ساتھ رو رہی ہے۔

دیوتا انوبیس:

اس دیوتا کا سر گیدڑ کا اور جسم آدمی کا ہے۔ یہ مردوں اور عذاب کا دیوتا کہلاتا تھا۔ اس دیوتا کے لیے مصری اساطیری قصہ ہے کہ دیوتا ازریس نے اس کی ماں دیوی نفتیس کو پیچھے سے دیکھا اور اپنی بیوی دیوی ازیس سمجھ کر مباشرت کی جس سے اس کو حمل ٹھہر گیا اور دیوتا انوبیس پیدا ہوئے۔ اس دیوتا کا نام الوبیس بھی لکھا جاتا ہے۔

ان دیوتاوں کے علاوہ بھی ان گنت دیوتاؤں اور دیویوؤں کی پوجا کی جاتی تھی۔ بلکہ ہر کام کے لیے الگ الگ دیوتا مقرر تھے۔ چاند کا دیوتا، شراب کا دیوتا، سانپ کے ڈھسنے کا دیوتا، جنگ کی دیوی، امن کی دیوی، دریائے نیل کا محافظ، شہروں اور شہریوں کا محافظ وغیرہ وغیرہ کی پوجا کی جاتی تھی۔ فراعنہ کے مذہب کے علاوہ سفر نامہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے آپ کو پیش کیا جارہا ہے۔ یعقوب نظامی لکھتے ہیں کہ :

پتیھد دیوتا فراعنہ کا تیسرا بڑا دیوتا تھا، جو سورج کے ماتحت تھا، اسے تخلیق کاروں اور ہنر مندوں کا دیوتا سمجھا جاتا تھا، فراعنہ کا تصور تھا کہ تمام تخلیقی کام اس دیوتا کی بدولت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے کے سنگ تراش، بڑھئی، لوہار، مستری، موچی، حجام، ڈاکٹر آرکیٹیک کا سرپرست اعلیٰ اسی دیوتا کو مانا جاتا تھا اور ممفیس میں اس کا بہت بڑا مندر تھا۔[۲۱]

اس دیوتا کو سورج کا دیوتا کا عکس بھی سمجھا جاتا تھا اور اس دیوتا کی قدیم مصر میں اتنی عزت تھی کہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ فراعنہ خود بھی اس کو سجدہ کرتے تھے اور کاریگروں کو بھی بڑے احترام سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ کاریگروں کی بدولت ہی بڑے بڑے اہرام بنائے جاتے تھے، بڑی بڑی کشتیاں بنائی جاتی تھیں اور اس کے علاوہ مردے جسم کو حنوط بھی کاریگر ہی کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اس دیوتا کی اہمیت وافادیت بڑ جاتی تھی، اس کے علاوہ آگ اور ہوا کا دیوتا شی تھا، زمین اور آسمان کا دیوتا جیب اور نٹ تھے جیسے فراعنہ خاندان خود کو اعلیٰ خون تصور کرتے تھے اسی طرح ان کے دیوتا بھی اعلیٰ اور ارفع تصور کیے جاتے تھے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

فراعنہ کے ان دیوتاؤں کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے، مثال کے طور پر دیوتا کی بیوی، بہن، ماں، باپ، بیٹا یا بیٹی چنانچہ ان رشتہ داروں کے بت ملک کے مختلف مندروں میں رکھے جاتے تھے۔ اگر کوئی گروہ نیا دیوتا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دیتا تو پروہت اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اسی مخالفت میں مختلف مندروں کے درمیان عقیدت مند اپنے دیوتاؤں کی لڑائیاں لڑتے تھے۔[۲۲]

جیسے زمین پر فراعنہ کی اجارہ داری تھی ویسے دیوتاؤں کی بھی اجارہ داری قائم تھی۔ نئے دیوتا کی پوجا کرنا جرم کے مترادف تھا ان کی دیوی اور دیوتاؤں میں صرف مرد اور عورت شامل نہیں تھے بلکہ فرعونی ادوار میں جانور دیوتا زیادہ مقبول تھے۔ اس حوالے سے ایک خاص قسم کا بیل کا تصور بھی ملتا ہے۔ یہ بیل سیاہ رنگ کا ہوتا تھا اس کو بڑا معتبر اور مقدس تصور کیا جاتا تھا اس ضمن میں ڈاکٹر الطاف لکھتے ہیں کہ :

مصریوں کے عبادت خانے، سانڈ مگر مچھ، باز، گائے، ہنس، بکرے، بلی، مینڈھے، کتے، مرغی، ابابیل، گیدڑ، سانپ کی نسلوں سے بھرے پڑے تھے۔[۲۳]

اگر یہ ان کے دیوتا نہیں بھی تھے لیکن ان کی عبادت اور پوجا کی جاتی تھی۔ جانوروں کی عبادت اور پوجا کا تصور دیگر ممالک اور تہذیبوں میں بھی ملتا ہے۔ اس لیے یہ امکان غالب ہے کہ فراعنہ ان کی عبادت کرتے تھے اور ان کی ممیاں بھی بناتے تھے چنانچہ عہد فراعنہ میں مذہب کے تصورات اور نظریات عجیب و غریب تھے۔ ان کے مذہبی روایات کی اساس دیوتا اوراز ریس کی کہانی پر مشتمل تھی۔ اس دیوتا نے اپنی بہن سے شادی کی تھی جو بیک وقت اس کی بہن بھی تھی اور بیوی بھی تھی۔ اس فرعون کو خود سے بھی افضل تصور کرتے تھے اور اپنی بہن بیٹی سے شادی کرتے تھے جس کی وجہ سے خون میں کوئی جنیاتی تبدیلی نہیں آتی تھی اور یہ لوگ مختلف بیماریوں کا شکار بھی رہتے تھے۔

بعد کے فراعین کا چہرہ ہی عجیب و غریب ہو گیا تھا ایک جانب سے سماجی برائی اور دوسری طرف سے بت پرستی کا عام رواج تھا ان کے ختم ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب شاید یہ بھی ہوتا تاہم ان کا مذہب دراصل بت پرستی اور اساطیری دیومالائی کرداروں پر مشتمل تھا۔ صرف ایک فرعون آختن نے اس سے اجتناب کیا تھا اور اس نے کثیر دیوتاؤں کے بجائے ایک دیوتا کی پوجا کو رائج کیا تھا۔ لیکن اس کے مرنے ،کے بعد پرویستوں اور فراعنہ نے پھر سے ان گنت دیوتاؤں کی پوجا شروع کر دی تھی۔

انسانی تاریخ میں ایسے دیوتاؤں کی پوجا کوئی نئی بات نہیں تھی یونان میں دیوتا زیروس کی پوجا کی جاتی تھی اور برصغیر کی وادی سندھ کی تہذیب میں بھی ان گنت دیوتاؤں کی پوجا کا تصور ملتا ہے۔ دار صل وہ عہد ہی اساطیری دیوتاؤں کی عبادت اور پوجا کا تھا۔ اسلام سے قبل خانہ کعبہ میں بھی تین سے زائد بت رکھے ہوئے تھے اور لات و منات یہاں کے افضل دیوتا تصور کیے جاتے تھے۔ سماج کی ارتقا کے ساتھ مذہب نے بھی ارتقا کا مرحلہ طے کیا ہے۔ تبھی کہیں جا کر انسان کثیر خداؤں سے وحدانیت کی منزل کو پہنچا ہے اور سارے دیوتا وقت کے ساتھ اپنی موت آپ مر گئے۔

مصری رہن سہن:

کسی بھی تہذیب و تمدن کے مطالعے کے وقت جہاں عقائد و مذاہب پر طاہرانہ نظر رکھی جاتی ہے وہیں پر اس خطے کے لوگوں کے رہن سہن کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے اور رہن سہن ہی اس خطے کی تمدنی طور واطوار کی عکاسی کرتی ہے۔ جیسے دریائے سندھ کے کنارے وادی سندھ کی تہذیب یعنی موہنجودوڑو کی کھدائی سے رہن سہن کے طور واطوار ملے ہیں کہ بڑے بڑے گھر اور محلے کی بڑی بڑی گلیاں ہوتی تھیں اسی طرح مصری لوگ عہدِ فراعنہ میں رہنے کا انداز کیسا تھا، ان لوگوں کے گھر کس چیز کے بنے ہوئے تھے۔ دراصل ان چیزوں اور

محرکات کے مطالعے سے تمدنی اقدار کا علم ہوتا ہے۔ مصر کی معیشت اور اقتصادی پہلو ہی مصری رہن سہن کو متعین کرتا ہے۔ کیونکہ جہاں خوشحالی اور دولت کی فراوانی ہو گی وہاں پر طرزِ زندگی بھی ترقی یافتہ شکل میں ہو گی اور لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ، چال چلن، اٹھنا بیٹھنا، رسومات ادا کرنا، خوشی و غمی کا تہوار منانا اسی معاش کے مرہون منت ہے۔

مصر میں چونکہ بادشاہت تھی اور فرعون اور اس سے قبل شاہی خاندان خود کو افضل سمجھتے تھے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ طبقاتی نوعیت کا تھا۔ جس سے یہاں غلاموں کا تصور بھی ملتا ہے۔ یعنی ایک طبقہ بادشاہت کا تھا جو احکامات جاری کرتا تھا اور یہ معاشرہ اپنے جوہر میں مذہبی بھی تھا اس لیے یہاں پروہت دوسرا حکم یا افضل طبقہ ملتا ہے۔ اب رعایا میں کسان اور کاریگر ملتے ہیں اور اس کے ساتھ غلام اور ان کا خاندان ملتا ہے۔ اس معاشرے میں ایک عجیب قانون رائج تھا کہ کوئی بھی شخص یا فرد اپنے اجداد کے ہنر و صنعت سے باہر دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا۔ مزدور کا بیٹا مزدور ہی بنے گا، کاریگر کا بیٹا کاریگر ہی بنے گا اور بادشاہ کا بیٹا تو پیدا ہی حکمرانی کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پروہت کا بیٹا اپنے والد کا پیشہ اختیار کرلے گا جبکہ درس و تدریس یا لکھائی پڑھائی صرف بادشاہ اور پروہت کی اولاد کے لیے ہوتی تھی۔ عام عوام کے لیے ممنوع تھی۔ اسی طریقے سے جب فراعنہ برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے انسان کی قربانی کو فروغ دیا۔

انسانوں میں سب سے افضل اعلیٰ بادشاہ کو تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے تہوار منائے جاتے تھے لیکن بادشاہ کو اپنی زندگی سے پیار بھی ہے۔ اس لیے وہ عارضی طور پر چند دن کے لیے تخت پر اپنے عزیز اور صحت مند غلام کو بٹھاتا تھا اور یہ غلام چند دن کے لیے بادشاہ کے محل میں بادشاہ بن کر رہتا تھا۔ بادشاہ کا لباس پہنتا تھا اس کی کرسی پر بیٹھتا تھا اور اس کی خواب گاہ میں آرام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی بیوی کے ساتھ سوتا بھی تھا اور جب قربانی کا دن آجاتا تب گیدڑ دیوتا آتا اور اس کو قربان گاہ کی جانب لے جاتا اس کو قربان کرنے کے بعد اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جاتے اور وہ ٹکڑے پروہتوں کے حوالے کیے جاتے۔

پروہت ان گوشت کے ٹکڑوں کو قبائل میں تقسیم کر دیتے اور قبائل کے لوگ عارضی بادشاہ کے ٹکڑوں کو زمین میں دفن کرتے تھے تاکہ فصل اچھی ہو کیونکہ وہ گوشت افضل تصور کیا جاتا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس قربانی کو بھی ختم کیا گیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ عارضی بادشاہ جو دراصل غلام ہوتا تھا وہ جب بادشاہ کی ملکہ کے ساتھ سوتا تھا اس سے بچہ بھی ہونے لگا پھر خالص خون اور کمتر خون کا جھگڑا شروع ہونے لگا۔ اس لیے

غلام کی جگہ ہرن کو قربان کیا جانے لگا۔ اس کے لیے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ رقص، موسیقی، شراب کی محفلیں کی جاتی تھیں اور بادشاہ کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے۔

اسی طرح جب دریائے نیل میں طغیانی آئی اور یہ نیل روانی سے بہتا تھا اور اس کے پانی کے ساتھ سیاہ مٹی بھی آئی تھی جو زیادہ زرخیزی کرتی تھی تب مصر کے لوگ خوشی کے شادمانے بجاتے گیت گاتے اور نیل کی پوجا کی جاتی تھی اور یہ گیت گا کر پانی کو خوش آمدید کہتے تھے:

زندگی دینے والا پانی آیا
اپنے ساتھ بہاریں لایا
سورج دیوتا طلوع ہوتا
آسمان جلد زمین ہلاتا
مشرق و مغرب کے پہاڑ اٹھاتا
سورج دیوتا مصر کو اپنی پناہ میں لے لیتا

یہ ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھا کہ نیل سے محبت و عقیدت کا احترام کرتے تھے چونکہ مصر کی زندگی اور معشیت زراعت پر مشتمل تھی اس لیے یہاں زندگی کا رنگ وڈھنگ، رہن سہن بھی زرعی تھا۔ یہ لوگ مٹی کے برتن بناتے تھے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار نے یوں تحریر کیا ہے:

> مصریوں کے گھر ایک ہی کمرے پر مشتمل ہوتے تھے، جو زیادہ تر کچی مٹی سے تیار کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ خیموں میں بھی رہتے تھے ایسے لوگ آبادی سے دور صحرا میں رہتے تھے۔ (۲۴)

خیموں میں رہنے والے بدو آج بھی مصر میں موجود ہیں اور اسی طریقے سے بکریاں، بھیڑ چراتے ہیں اور کچے گھر بنانے کی وجہ سے سیلاب بھی ہو سکتا ہے جبکہ فراعنہ خود محلات میں رہتے تھے اور زندگی کی تمام عیش و عشرت ان کے پاس ہوتی تھی۔ ہم نے ہیرے اور جواہرات کا تذکرہ پہلے بھی کیا ہے کہ یہاں سونا کافی مقدار میں استعمال ہوتا تھا اور بادشاہوں اور فراعنہ کے مقبرے سے پلنگ بھی ملے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فراعنہ پلنگ پر سوتے تھے اور عام عوام زمین پر سوتی تھی اور بیٹھنے کے لیے پڑھے یا اسٹول استعمال کرتے تھے جو امیر و غریب دونوں استعمال کرتے تھے۔ کھانا پکانے کے لیے چولہے بھی ملے ہیں جس سے اندازا ہوتا ہے کہ کھانا آگ پر پکاتے تھے اور اس کے لیے چولہے استعمال کیے جاتے تھے۔ جبکہ پیالے، ہانڈی، تھالیاں وغیرہ مٹی

کی ہوتی تھیں۔ مٹی کے برتنوں کا استعمال ہمارے ملک میں آج بھی کہیں کہیں دیہاتوں میں رائج ہے اس حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ :

> دنیا کے بیشتر غریب مسلم ممالک میں مسجدوں میں وضو کے لیے مٹی کے کوزے استعمال کیے جاتے ہیں، ایسے کوزے ہزاروں سال پہلے فراعنہ دور میں استعمال ہوتے تھے، زیورات بھی صراحی نما مٹی کے برتنوں میں محفوظ رکھے جاتے تھے غلہ بھی مٹی سے تیار کردہ اسٹور یج گلوٹی نما ہوتے تھے، گھر میں فرنیچر برائے نام ہی ہوتا تھا۔[۲۵]

یعنی یہاں کے لوگوں نے مٹی کے اوزار اور برتن بنانے کا فن سیکھ لیا تھا اور ایسے برتن بھی استعمال کرتے تھے جس میں وہ اپنے قیمتی اشیاء، زیورات محفوظ کر کے رکھ سکیں۔ نیز گندم، غلہ بھی مٹی کی گوٹھی نما کمرے میں حفاظت سے رکھتے تھے اور یہ لوگ کھیتی باڑی بھی مل جل کر کرتے تھے۔ کسان کے ساتھ اس کی بیوی، بیٹا اور بیٹی بھی کھیت پر کام پر جاتے تھے۔ اس کے ساتھ کاریگر کا بیٹا بھی اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا اور وہی ہنر سیکھتا تھا۔ جوان لڑکے فرعون کی فوج میں بھی بھرتی ہوتے تھے۔ ملک اور سلطنت کی حفاظت کرتے تھے، جنگیں لڑتے تھے اور مذہبی یا بادشاہ کے کام پر بیگار لی جاتی تھی۔ مثلاً مندر کی تعمیر کے لیے کسانوں اور غلاموں کے بیٹے اور بیویاں بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر جاتے تھے۔ جبکہ غمی و خوشی میں سب ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور ہاتھ بٹاتے تھے، فارغ وقت میں عبادتیں کی جاتی تھیں۔ ڈرامے اور تماشے بھی کیے جاتے تھے اور مختلف کھیل کھیلے جاتے تھے جس میں مچھلی پکڑنا، کشتی رانی اور تیراکی ان لوگوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ سنگ تراش، پیکر سازی، مصوری بھی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی گھرانوں کی عورتیں بھی دریائے نیل میں تیراکی کیا کرتی تھیں۔

اگر مصر کی تہذیب اور تمدن کی صرف فرعون کے ظلم و جبر سے دیکھا جائے تو اس تہذیب کی اساس کو سمجھنے میں فاش غلطی کریں گے۔ اس تہذیب کی انفرادیت اس میں پنہاں ہے کہ یہاں عورتوں کو مردوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ قانون میں دونوں مساوی حقوق رکھتے تھے۔ جنس یا جسمانی بناوٹ کی وجہ سے نفرت یا کمتر درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان باتوں کا عملی اطلاق بھی ہوتا تھا۔ عورتیں ہونٹ اور آنکھوں کے گرد رنگ لگاتیں تھیں، زیور پہنتی تھیں، تیل، پھول اور خوشبو استعمال کرتی تھیں اور اپنے فیصلوں میں بااختیار ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر الطاف لکھتے ہیں کہ :

عورت کو طلاق دینا آسان نہ تھا۔ عقد میں آنے والی عورت کو جائیداد میں اچھا خاصا حصہ ملتا، ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ کسی بھی قدیم وجدید تہذیب نے عورت کو وہ بلند قانون رتبہ نہیں دیا جتنا وادی نیل کے باشندوں نے دیا۔[۲۶]

جب یہاں یونانی آئے تب انھوں نے عورت کی آزادی اور حقوق کو دیکھ کر حیران رہ گئے نیز عورت کی قدغن نہ تھی۔ اسے جنسی تعلق رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کی آزادی تھی۔ نیز لڑکی کو جب پہلا حیض آتا تو اسے جوان تصور کیا جاتا اور اس کی شادی کر دی جاتی تھی اور لڑکا جب سنِ بلوغت کو پہنچتا تو اس کا ختنہ کر کے اس امر کا اعلان کر دیا جاتا کہ لڑکا اب جوان ہو گیا ہے۔ افریقہ کے بعض قبائل میں یہ رسم ہنوز برقرار ہے۔ تاہم افزائش نسل کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ لڑکا یا لڑکی کی پیدائش پر برابر خوشی منائی جاتی تھی اور سب سے بڑی اولاد خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ہو والدین کی آخری عمر میں دیکھ بھال اور کفن دفن کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ لڑکی جب حاملہ ہوتی تھی بڑی خوشی کی جاتی تھی لیکن بیٹا یا بیٹی متعین کرنے کا انداز بڑا عجیب تھا:

جب لڑکی حاملہ ہو جاتی تو لڑکی کو کہا جاتا کہ وہ گندم یا جوار کے کھیتوں میں پیشاب کیا کرے یوں اگر پودے جلد پھول اور پھل دینا شروع کریں تو سمجھا جاتا تھا کہ لڑکا پیدا ہو گا اور اگر زمین گھاس پھوس اگے تو سمجھا جاتا تھا کہ لڑکی ہو گی اور گران دونوں میں سے کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تو سمجھا جاتا کہ لڑکی ابھی حاملہ نہیں ہے۔[۲۷]

یہ ان کا بڑا اچھوتا انداز تھا جنس اور حمل متعین کرنے کا ایسا طریقہ خالصتاً زراعت سے تعلق رکھتا ہے اور اس عہدِ جدید میں اس طریقے کو لغو ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ عمومی طور پر شادیاں کامیاب ہوتی تھیں اور اگر ناکامیاب ہوں تو طلاق کی صورت میں مرد اور عورت کو دوسری شادی کرنے کا اختیار تھا۔

مصر چونکہ دریائے نیل کے کنارے آباد تھا اس لیے یہاں کاشت کاری اور زراعت وافر مقدار میں ہوتی تھی۔ فراعنہ کاشت کاروں کو فلاحین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں ہل وہی استعمال ہوتا تھا جو آج بھی ہمارے جیسے ممالک میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کھدائی کے دوران ایک ایسا ہل ملا ہے جس میں لوہے کا پھال بھی موجود ہے۔ ہل کے علاوہ پھاوڑا جس سے زمین کھودی جاتی ہے وہ بھی ویسا ہی ہے بالکل اسی طرح کے پھاوڑا آج بھی استعمال میں آتے ہیں اور ان کے فصل کا وہی طریقہ رائج تھا جو زرعی سماجوں میں ہوتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک اور رسم تھی جو ہمارے یہاں آج بھی منائی یا ادا کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ:

کسی کے فوت ہونے کی صورت میں چالیس دن کے بعد ایک جشن برپا ہوتا تھا جس میں عزیز و اقارب جمع ہوتے، کھانے پینے کے علاوہ گانے بجانے اور ناچ گانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ گانے زیادہ تر مرحوم یا مرحومہ کی صفت میں گائے جاتے تھے بلکہ آج بھی یہ رسم مصر کے دیہات میں موجود ہے۔[۲۸]

اگر اس رسم میں گانے بجانے کے علاوہ غور کیا جائے تو یہ چالیسویں کی رسم معلوم ہوتی ہے جو ہمارے معاشرے میں اب بھی کی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں چالیسویں میں کھانے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور مرحوم کی یادیں بھی تازہ کی جاتی ہیں۔ آنے والے سارے لوگ اسی کی کوئی نہ کوئی بات کرتے ہیں۔ شاید یہیں سے چالیسویں کی رسم چلی ہو حالانکہ اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ الغرض مصری مجموعی طور پر محنتی اور مذہبی خیالات کے لوگ تھے جو ان کے رہن سہن اور طور اطوار سے بھی عیاں ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کو بھی پسند کرتے تھے، ڈراموں اور تماشوں کے بھی شائق تھے۔ طرزِ حیات انتہائی سادگی سے بسر کرتے تھے۔ زیورات پہننا مرد اور عورت دونوں کو پسند تھا۔ موسیقی، رقص، شراب، خوشی اور جشن کے وقت استعمال کرتے تھے جنسی تعلقات پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی لیکن شادی کے بعد شوہر یا بیوی کا وفادار رہنا لازم تھا۔ مرد اور عورت کو مساوی حقوق حاصل تھے۔ اوزار بنانے کے ماہر تھے، کشتی رانی پر تجارت بھی کیا کرتے تھے اور خوش حال زندگی بسر کرتے تھے۔

حسن مصر:

انسان فطرت کی خوب صورت ترین تخلیق ہے۔ اس لیے وہ خوب صورتی کا خواہاں اور متلاشی بھی ہے۔ خوب صورتی اور جمالیات پر اتنے مباحث کیے گئے کہ یہاں ان کو سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ خوب صورتی انسان کی آنکھ میں ہوتی ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ خوب صورتی بذات خود وجود رکھتی ہے۔ پر کشش، جاذب اور دل کش نظر آنا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے لیکن بعض لوگوں کو فطرت سے قدرتی خوب صورتی عطا کی ہوئی ہوتی ہے جبکہ ہر خطے کے اعتبار سے خوبصورتی کا تصور بھی تبدیل ہوتا ہے۔ نیز خوب صورتی کا جوہر متناسب نقش و نگار، جسمانی خدوخال اور خط کے ساتھ رنگ سے بھی استوار ہوتا ہے اور یہ تمام ظاہری مظہر ہیں جو داخلی قوت کو جلا بخشتے ہیں جبکہ اس میں جنس کا بھی عمل دخل کارفرما ہے۔ لہذا حسن ایک حقیقی مظہر ہے اس لیے مختلف دیومالائی قصوں میں حسن کی دیوی کا تصور بھی ملتا ہے۔

یونانی قصوں میں دیوی ایفروڈائڈی حسن اور خوب صورتی کے ساتھ پیار و محبت کی دیوی کہلاتی تھی۔ مصر میں اس طرح حسن کی دیوی مخصوص نہیں تھی ماسوائے دیوی یانور کے۔ وہ بھی نسوانی مظہر کی دیوی کہلاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مصریوں میں حسن کا تصور اپنے خطے کے جغرافیائی آب وہوا سے نمو پاتا ہے کہ لمبی سی گردن، ترچھی ناک اور بڑی سیاہ آنکھیں خوب صورتی کی علامت مانی جاتی تھیں۔ اس طرح ملکہ قلوپطرہ کا حسن و جمال، یونان اور روم تک مشہور تھا۔ جس نے اپنی دل آویز اور دلکش انداز سے بادشاہوں کے ہوش خطا کر دیئے تھے۔ یہ فرعون بادشاہ پٹولمی کی بیٹی تھی اور مصری رسم ورواج کے مطابق اپنے بھائی سے شادی کی پھر دوسرے بھائی سے شادی کی لیکن اس کے حسن اور محبت کی لافانی کہانی جولیس سیزر سے شروع ہوتی ہے اور اس کی موت کے بعد انتون سے شادی کرتی ہیں اور جب رومن حملہ کرتے ہیں تب شکست کو دیکھتے ہوئے خودکشی کر دیتی ہیں لیکن قلوپطرہ مصری تاریخ میں حسن کی ملکہ کے طور پر مشہور ہیں۔ ملکہ قلوپطرہ کے حوالے سے سفر نامہ نگار نے ان کے حسن پر جو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ:

> حکومت کے ساتھ ساتھ قلوپطرہ کے حسن کی شمع روشن ہوتے ہی ارد گرد پروانے جمع ہونے لگے جو حسن کی گرمی میں جلتے اور مرتے رہے قلوپطرہ کا لازوال حسن محدود رہنے کے حق میں نہیں تھا۔[۲۹]

ملکہ قلوپطرہ کے حسن اور حکومت کے چرچے ریاست مصر کے باہر بھی ہونے لگے لیکن حکومت کی ایک اپنی نفسیات ہوتی ہے جس میں کوئی کسی کا بھائی یا بہن نہیں ہوتی بس حکمرانی کی ہوس ہوتی ہے اور ریاست کی جاہ و جلال ہوتی ہے۔ اسی ہر س و حوس نے ملکہ قلوپطرہ اور اس کے بھائی میں ان بن ہو گئی اور قلوپطرہ ملک سے باہر چلی گئیں اور اپنے غمزہ سے چولیس سیزر کو جال میں پھنسا دیا کہتے ہیں کہ اس زمانے کے بڑے بڑے بادشاہ ملکہ قلوپطرہ کے حسن کے سامنے بے بس تھے چنانچہ مصری ملکاؤں میں قلوپطرہ حسن اور چال بازی کی وجہ سے مقبول رہی ہیں اور حکومت کی رسہ کشی میں بلاآخر جولیس سیزر کے فوت ہونے کے بعد اینتھونی سے شادی کر لی۔ لیکن پھر روم کے حملے میں شکست کو دیکھتے ہوئے انھوں نے خودکشی کر لی ان کی خودکشی بھی ایک معمہ ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے زہریلی دوا کھائی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے خود کو زہریلے کوبرا سانپ سے ڈسوایا تھا اور اس طرح ملکہ جو حسن و عشق اور خوبصورتی کی کہانی اور داستان تھی زہر کی نذر ہو گئیں خواہ وہ سیاسی زہر ہو یا کالے سانپ کا زہر ہو لیکن دونوں جان لیوا ہوتے ہیں۔ انگریزی کے مشہور ڈرامہ نگار

شیکسپیئر کی تحریر نے مارک انتھونی اور قلوپطرہ کی محبت و عشق کی داستان کو امر بنا دیا ہے۔ ملکہ قلوپطرہ کے حوالے سے بعض رومی کہتے ہیں اور بعض یونانی کہتے ہیں لیکن ''جب نیل کے پانی کا تڑکا لگا تو حسن نے نکھرنا ہی تھا۔''(۳۰)

ملکہ قلوپطرہ کا حسن و جمال، مصری تہذیب پر یوں نقش ہیں گویا اب تک قائم ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ملکائیں بھی اپنی جاذبیت، حسن اور خوب صورتی کی وجہ سے ہزاروں سال بیت جانے کے بعد مشہور و مقبول ہیں۔ ان میں ایک ایسی حسین عورت بھی تھی جس کا تعلق نہ اہل فراعنہ سے تھا اور نہ ہی دیوتاؤں کے خانوادے سے تھی چنانچہ اس نے رقص و موسیقی اور اپنے جسم کے دل آویز اداؤں سے مصر سے روم تک حکمرانی کی۔ یہ حکمرانی ملکاؤں کے طرز کی نہیں تھی بلکہ حسن اور اداؤں کی حاکمیت تھی۔

چنانچہ اس مصری حسینہ کا نام تھیوڈورا ہے۔ اس نے شکم کی آگ بجھانے کے لیے رقص اور مجرے کیے اور رومی حکمرانوں نے جب اس کے رقص اور جسم کا لمس محسوس کیا اور ذائقہ چکھا تب اس کی خوب صورتی کے قصے اور چرچے شاہی محلات تک پہنچے اور پھر اس سے روم کے طاقتور بادشاہ جسٹینین نے شادی کی۔ اس نے اپنے شوہر کو مفید مشورے بھی دیئے جس سے اس کی حکمرانی کی گرفت مزید مستحکم ہوئی اور روم میں بھی فتوحات اور شہری اصلاحات کا سلسلہ ہوا، سڑکیں اور شاہرائیں تعمیر ہوئیں، تعلیمی ادارے بنائے گے اور کم عمر لڑکیوں کی جنسی عمل کے لیے خرید و فروخت پر پابندی لگی۔ ایک ایسی خاتون خود رقاصہ تھیں اور رقص کرتی تھیں جب اس کی شادی بادشاہ سے ہوتی ہے تو وہ تمام غیر اخلاقی قوانین پر پابندی لگوانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ اپنے حسن کی وجہ سے ملکہ نفرتاری بھی مشہور رہی ہیں یہ ملکہ رعمیس ثانی فرعون کی پہلی اور سب سے طاقتور اور خوب صورت بیوی تھی۔ ہرچند کہ یہ صرف چھپن سال زندہ رہی لیکن اس کے حسن اور خوب صورتی نے وادی ملکہ میں ان کی شانِ شایان مقبرہ تعمیر کروایا اور اس کے علاوہ تیسری ملکہ حسن اور ملکہ نیل، نفریتی ملکہ بھی اپنے حسن اور خوب صورتی کی وجہ سے مصری تاریخ میں زندہ و جاوید رہیں۔ اس حوالے سے سفرنامہ نگار نے لکھا ہے کہ :

> خوب صورت نقش و نگار اور اپنی لمبی صراحی دار گردن کی بدولت یہ ملکہ اپنے حسن کا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔(۳۱)

نیز لوگ اسے پیار سے ملکہ نیل کہا کرتے تھے اور مصر میں سب سے زیادہ مجسمے اس ملکہ کے نصب کیے گئے ہیں اور اس کا وجود دار اصل قدیم مصری حسن کا ایک شاہکار تھی۔ اس نے اپنے خاوند فرعون آختنائن کے پہلو میں کھڑے ہو کر اور دو دہائیوں تک مصر پر حکومت کی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں، صراحی دار گردن اور لمبے سے تاج کے ساتھ بہت ہی منفرد نظر آنے کے باوجود اس نے ذہانت اور عظمت کی بے شمار داستانیں مصریوں اور دنیا والوں کے لیے چھوڑ گئی ہیں۔ الغرض کہ مصر کا حسن دنیا کی دیگر خوب صورتی سے انفرادیت رکھتا ہے اور سفر نامہ نگار نے یہاں جو حسن دیکھا اس کو بیان کیا ہے اور ہم بھی اسی ہی پر اکتفا کریں گے۔

مصری قدیم ادب میں محبوب اور حسن کی تعریف ملتی ہے بلکہ مصری مرد کو مصری عورت سے پیار و محبت، عشق و عاشق کے لیے پابند کیا جاتا تھا اور انہیں تلقین کی جاتی کہ :

> باہر سے آنے والی ایسی عورتوں سے ہوشیار ہو یہ گہرے پانیوں کے بھنور کی مانند ہوتی ہیں۔ (۳۲)

اہل مصر کے لوگ مصری عورت کی محبت اور حسن کو اولیت دیتے تھے کیونکہ انہیں اس چیز کا اندازہ تھا کہ مصری مرد کو روحانی، قلبی اور ذہنی سکون صرف مصری عورت فراہم کر سکتی ہے جو اس کے مزاج اور دل کے انتہائی قریب رہتی ہے۔ اسی طرح ایک مصری باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

> اگر تم نے اپنا گھر کامیابی کے ساتھ سجا سنوار لیا ہے اور خوب صورت ترین بیوی تمہاری آغوش میں ہے تو اس کا پیٹ بھرو اور کمر پر کپڑا ڈالو اس کی خوشی کا سامان مہیا کرو کیوں کہ یہ منافع بخش کھیتی ہے اگر تم نے اس کا دل توڑا تو خبر دار یہ سب کچھ تباہ کر دے گی۔ (۳۳)

چنانچہ قدیم مصری ادب میں مصری حسن کی تعریف بھی ملتی ہے شعر و ادب میں اشعار بھی ملتے ہیں اور والہانہ محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ جس میں شاعر اپنی محبوبہ سے پیار کا اظہار کرتا ہے اور اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے اس کی نشیلی آنکھوں پر اشعار رقم کرتا ہے اور محبت کا اظہار بھی کرتا ہے مثلاً:

> تم دوسری لڑکیوں سے ہزار گنا زیادہ حسین ہو
> تم تو اک طلوع ہوتے ستارے کی مانند ہو
> دیکھنے کے لیے تمہاری خوب صورت آنکھیں ہیں
> بوسے دینے کے لیے رس بھرے شیریں ہونٹ ہیں

قدیم مصری ادب میں ایسے اشعار کی بہتات ملتی ہے جس میں خوب صورت آنکھوں اور رس بھرے ہونٹوں کے گیت ملتے ہیں اور پیار و محبت کا والہانہ جذبات سے سرشار اشعار ملتے ہیں۔ ہمارے سفر نامہ نگاروں نے وہاں جو حسن دیکھا اس کو جس ڈھب سے بیان کیا ہے وہ خود باعث تعریف ہے۔ کم و بیش تمام سفر نامہ نگاروں نے مصری رقص کا ذکر بھی کیا اور وہاں کی بہترین گلوکارہ ام کلثوم کی تعریف بھی لکھی ہے۔ ام کلثوم مصر کی بہت مشہور اور خوب صورت گائیکہ تھیں انھوں نے ملکہ نور جہاں کے ساتھ مل کر علامہ اقبال کی نظم شکوہ اور جواب شکوہ بھی گائی تھی اور یہ اسلامی کانفرنس کے دوران پاکستان آچکی تھیں، چنانچہ اس کی آواز اور حسن کے متوالے آج بھی اس کو یاد کرتے ہیں اور گیتوں پر داد دیتے ہیں۔

مصر میں اب بھی جو ثقافتی رقص ہوتے ہیں اس میں ام کلثوم کے گیت شامل ہوتے ہیں۔ مصری رقص ایک تاریخی تسلسل رکھتا ہے۔ ویسے بھی عہدِ فراعنہ میں رقص عبادت کا حصہ تھا گو کہ عہد فراعنہ کو گزرے ہوئے صدیاں ہو گئیں ہیں لیکن رقص اور موسیقی یہاں کا اٹوٹ حصہ بن چکی ہیں۔ جس میں مرد اور عورت برابر حصہ لیتے ہیں اور رقص کو ویسے بھی جسم کی مصوری کہا جاتا ہے۔ سمندر میں لہریں رقص کرتی ہیں اور یوں بدن میں لہریں اٹھتی ہیں چنانچہ ڈاکٹر مکھیانہ اس کی منظر کشی یوں بیان کرتے ہیں:

> ایک حسینہ اچانک سے اسٹیج کی ایک جانب سے ایسے نمودار ہوئی کہ ہمارے سمیت سب کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ایک تو وہ یقیناً بہت دل کش نین و نقش کی مالکہ تھیں اوپر سے نجانے کس کی فرمائش پر کالا لباس پہن کر آئی تھیں جس سے اس کے حسن کو چار نہیں بلکہ درجنوں چاند لگ گئے تھے۔ (۳۴)

مصری ثقافتی رقص میں اب بیلی ڈانس بھی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ رقص عرب میں بہت مقبول ہے اور یہ اب مصر میں بھی کیا جاتا ہے۔ یہ بیلی ڈانس کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ڈانس دیکھتے دیکھتے خود اپنی بیلی کو بھی ڈانس پر مجبور کر دیتے ہیں اور اگر یہ ڈانس صحرا میں کیا جائے تو اس کا لطف بالا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مصری رقص اور حسن کا تجزیہ ڈاکٹر صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

یہ رقاصہ حسن مصر کا ایک شاہکار نمونہ تھی، ہم اس طرح کے اور نمونے شاید اس لیے نہ دیکھ سکے کہ ان کی تاب نہ لا سکیں گے یا پھر یہ ہماری قسمت میں ہی اتنا ہی حسن مصر دیکھنا لکھا تھا۔ (۳۵)

مصر کا حسن پہلے بھی دنیا بھر میں مشہور و مقبول تھا اور اس عہدِ جدید میں بھی اپنی نظیر آپ ہے اور یہاں کے ثقافتی رقص کا کوئی ثانی نہیں ویسے بھی ہر خطے کی ثقافت اور وہاں کی موسیقی، رقص اپنی انفرادیت رکھتی ہے اور یہی انفرادیت مصری کبیرے اور بیلی ڈانس میں ہے۔ جو ان کا روایتی رقص ہے اور تقریباً ہر جگہ کھلے عام ہوتا ہے اور ان کے مرد اور خواتین میں یکساں مقبول ہے اور بڑے ذوق و شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ مصری حسن کی منظر کشی ڈاکٹر الطاف نے اچھی طرح سے پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

دریائے نیل کے کنارے جوان جوڑوں کی بیٹھک دریا کے حسن میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔ (۳۶)

انھوں نے یہ عبارت دریائے نیل کے کنارے حسن و محبت کے جوڑوں کو دیکھنے کے بعد لکھا کہ یہاں حسین و جمیل لڑکیاں اپنے محبوب کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیوں میں مشغول رہتی ہیں اور اسی دوران پھول فروخت کرنے والی عورتیں ان کے پیار و محبت میں خلل ڈالنے بھی آتیں ہیں لہذا مصر کا رقص، موسیقی، فنونِ لطیفہ اور یہاں کا حسن اپنی جاذبیت کی وجہ سے پوری دنیا کے لیے توجہ کیا مرکز بنا ہوا ہے اور مصر کی خوب صورتی کا معیار بھی لمبی صراحی دار گردن، بڑے ہونٹ اور بڑی سیاہ آنکھیں مقبول ہیں۔

فراعنہ کا لباس:

لباس، رہن سہن اور کھانا پینا جغرافیائی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں کی آب و ہوا جیسی ہو گی لوگ ویسا لباس استعمال کرتے ہیں جبکہ عہد قدیم میں انسان تمدنی اقدار سے آشنا ہو رہا تھا۔ اپنے اندر کئی تبدیلیاں لا رہا تھا ایک عرصے تک انسان نے صرف جانوروں کی کھال سے بنائے ہوئے لباس کو استعمال کیا جس میں محض ستر کو ڈھانپا جاتا تھا انسان نے بہت بعد میں جانوروں کی کھالوں سے کوٹ اور دیگر پہننے کے لباس بنائے یہ سماجی اور ذہنی ارتقا کا مظہر ہے کہ اب انسان اپنے پورے جسم کو ڈھانپتا ہے۔

انسان نے جب کپڑے بنانے کا ہنر یا طریقہ سیکھ لیا تب اس نے چمڑے کی جگہ کپڑے کے لباس بنانے کا رواج ڈالا، قدیم تہذیبوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کئی صدیوں تک محض چمڑے کو استعمال کیا

کرتے تھے پھر کپڑے کی طرف آیا اس طرح عہدِ فراعنہ میں بھی کپڑے کا استعمال ملتا ہے۔ یعنی یہاں ہر لباس کپڑے کے استعمال کیے جاتے تھے۔

گرم خطے کے لوگوں کا لباس سرد علاقے کے لوگوں سے کافی منفرد اور الگ تھلگ رہا ہے چونکہ مصر صحرائی اور گرم خطہ رہا ہے اور اس لیے یہاں کا لباس بھی موسم سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں یعقوب نظامی لکھتے ہیں کہ :

> فراعنہ بادشاہ لنگوٹ نما ایک لباس پہنا کرتے تھے یہ لنگوٹ تہبند کی طرح مختصر انگریزی لباس جو منی اسکرٹ جیسا ہوتا تھا جو گھٹنوں سے اوپر ہی رہتا تھا، قمیں نہیں پہنتے تھے۔(۳۷)

لنگوٹ یا تہبند کا استعمال برصغیر میں بھی برسوں تک رہا ہے بلکہ ابھی بھی دیہات میں بزرگ لوگ پہنا کرتے ہیں یہ لباس گرم ماحول کے علاوہ زرعی معاشرے میں عام طور پر پہنا جاتا تھا اب اس کو انگریزی میں اسکرپٹ بھی کہا جائے لیکن یہ لباس گرم خطوں کی پہچان رہی ہے اور ہمارے یہاں تہبند پر قمیض پہنا جاتا رہا ہے لیکن مصری فراعنہ قمیض نہیں پہنتے تھے۔ اس کے علاوہ سر پر تاج پہنتے تھے اور بادشاہ اس تاج میں اختراع بھی کرتے تھے جبکہ مصر دو حصوں میں منقسم رہا ہے اس لیے جنوب کے بادشاہ سفید تاج پہنتے تھے اور شمال کے بادشاہ سرخ تاج کا استعمال کرتے تھے۔ نیز جب دونوں خطے یا حصے متحد ہوئے تو بادشاہوں نے بھی تاج میں تبدیلی کر لی اور سفید و سرخ رنگوں کو یکجا کر کے تاج پہننا شروع کر دیئے اور یہ یکجا رنگوں والا تاج اتحاد کی علامت سمجھا جانے لگا۔

اس کے علاوہ عمومی طور پر داڑھی مونڈ دیتے تھے کیونکہ فراعنہ عہد کی تصویروں اور مجسموں میں کسی بھی بادشاہ کو کسی بھی قسم کی داڑھی دیکھنے کو نہیں ملی اس سے قرین قیاس کیا جاتا ہے کہ اس عہد کے بادشاہ داڑھی مونڈ دیتے تھے چنانچہ بادشاہوں کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ تاج کے علاوہ چوڑا ہار بھی پہنا کرتے تھے جو اکثر موتیوں سے بنے ہوتے تھے۔ فراعنہ عہد کی ملکاؤں کے لباس کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ وہ:

> شاہی خواتین گاون نما ایک لمبا سفید رنگ کا لباس پہنتی تھیں، فیشن کے طور پر کمر بند ہوتا تھا جسے باندھنے کے بعد اس کے سرے لٹکتے رہتے تھے۔ ملکائیں سر پر تاج بھی پہنتی تھیں۔(۳۸)

مرد بادشاہ اسکرپٹ یا لنگوٹ استعمال کرتے تھے اور عورتیں گاؤن نما ایک لمبی قمیض پہنتی تھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لباس سادہ تھا۔ لیکن ان کے لباس کے لوازمات بہت زیادہ ہوتے تھے۔ ملکائیں بھی سر پر تاج پہنتی تھیں لیکن ان کے تاج میں کوبرا سانپ ہوتا تھا اور اس سانپ کی صورت اور شکل ایسی ہوتی تھی کہ ابھی کسی کو کاٹ کھائے گا۔ اس کے علاوہ عورتیں زیورات پہنتی تھیں۔ بازو، گلے اور پاؤں میں مختلف قسم کے زیوارت پہنتی تھیں یہ زیورات سونے کے بنے ہوتے تھے ان زیورات کے ڈیزائن سے لگتا ہے کہ اس زمانے کے سونار بڑے ماہر اور ہنر مند ہوتے تھے چنانچہ اس زمانے کے تیار کردہ زیورات قاہرہ کے عجائب گھر میں بھی موجود ہیں۔

شاہی خاندان کی ملکائیں اور خواتین کے علاوہ عام خواتین بھی ایسا لباس پہنتی تھیں کہ جس سے جسم کو ڈھانپ لیا جائے اور ہار سنگار اس عہد کا عام چلن تھا۔ سرمہ اور آنکھوں کے گرد خوشحالی کے کے کوئی چیز استعمال کرتیں تھیں جو اس عہد میں عام طور پر دستیاب ہوتی تھی۔ جبکہ امیر خواتین کریم بھی لگاتی تھیں جو اکثر زیتون کے تیل سے تیار کی جاتی تھی عورتیں سر کے بال لمبے رکھتی تھیں اور بعض اس عہد کے فیشن کے مطابق سر کے بالوں میں کنول کا پھول سجاتی تھیں۔ بالوں میں پھول سجانے کا رواج آج کے دور میں بھی عام ہے۔ چنانچہ فراعنہ عہد کی کچھ غلام خواتین کی برہنہ تصویریں بھی ملی ہیں شاید انھیں جسم ڈھانپنے کی سہولت سے محروم رکھا جاتا تھا لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ نیز اس زمانے کے عام لوگوں کے جسم پر ایک مختصر سا لنگوٹ ہوتا تھا۔

فراعنہ دور کی متعدد تصویریں جو ان کے مقبروں سے دریافت ہوئی ہیں اور قائرہ کے عجائب گھر میں نمائش کے لیے رکھی گئیں ہیں ان میں یہ چیز دیکھنے کو ملی ہے کہ محنت کش طبقہ چاہے کھیت میں کام کر رہا ہو ہل چلا رہا ہو یا پھر کشتی رانی پر مامور ہوتا اسے مختصر سے لباس ہی میں دیکھا گیا ہے۔ جبکہ قمیض اور پاؤں میں جوتا کسی بھی تصویر میں نہیں ملا، چونکہ مصر کا موسم گرم ہوتا تھا اس لیے وہاں پر رضائی اور کمبل نما کوئی چیز استعمال کو نہیں ملی ہے۔ ممکن ہے کہ چادر استعمال کرتے ہوں۔ عام لوگوں کے بال زیادہ بڑے دیکھنے کو نہیں ملے ہیں۔ جوتے اور مناسب بال ملے ہیں شاید وہاں مردوں کے بڑے بال رکھنے کا رواج نہ ہو اور اس کے علاوہ "کنول کا پھول مصر کا قومی پھول تصور ہوتا تھا۔"[۳۹]

اس لیے فراعنہ کی ملکائیں اپنے بالوں میں کنول کا پھول سجاتی تھیں اور عام خواتین بھی اس کا استعمال کرتی تھیں۔ مصریوں کا یہ روایتی لباس اب جبوں میں تبدیل ہو گیا ہے چنانچہ فراعنہ عہد کے لباس پر ڈاکٹر الطاف یوں رقم طراز ہیں:

اس زمانے میں بچے اور بچیاں اٹھارہ انیس سال تک بالیوں اور گلوبند کے علاوہ بے لباس پھرتے تھے۔ تاہم لڑکیاں کمر کے گرد منکوں کا کمر بند باندھ کر ایک ظاہری حجاب بناتیں۔ ملازم اور کسان لوگوں کے عام کپڑوں میں صرف ایک لنگوٹی شامل تھی۔(۴۰)

یہ ممکن ہو کہ سنِ بلوغت کے بعد لڑکیوں کے لیے لباس مخصوص ہو لیکن جب تک سنِ بلوغت یا شادی سے پہلے ان کے لیے یہی لباس رائج ہو جبکہ عام لوگوں کے لباس کا مکمل تذکرہ پہلے کر چکے ہیں اور انھوں نے آزاد مرد اور عورتوں کے لباس پر لکھا ہے کہ :

قدیم بادشاہت میں آزاد مرد اور عورتیں ناف تک برہنہ پھرتے اور کمر سے گھٹنوں تک کا حصہ چھوٹی سی چست قمیض سے ڈھانپتے، خوشحال گھرانوں کی عورتیں چست قمیض ترک کر کے ڈھیلی ڈھالی قبا پہنتی تھیں جو کندھے کے اوپر سے آگے آتی اور دائیں چھاتی کے نیچے گرہ کی صورت میں بندھی ہوتی۔(۴۱)

الغرض کہ قبا اور چست قمیض کا استعمال خوشحال اور فراعنہ کی ملکائیں عمومی طور پر کرتی تھیں اور عام لوگ صرف لنگوٹی پہنتے تھے اور فراعین کی ملکائیں اپنی زیبائش اور ہار سنگار کے لیے چہروں پر غازہ، ہونٹوں پر سرخی لگاتی تھیں اور ناخنوں پر بھی رنگ یا نیل پالش جیسی رنگ استعمال کرتی تھیں، بالوں اور جسم کو نفیس رکھنے کے لیے تیل استعمال کر لیتی تھیں اور اس کے علاوہ کریمیں، آئینہ، بالوں کی سوئیاں، کنگھیاں، سنگھار پٹی وغیرہ بھی استعمال کرتی تھیں اور فراعنہ عہد میں مرد و عورت دونوں گردن، چھاتی، بازو، کلائی اور ٹخنوں پر بھی زیورات پہنتے تھے اور اس کے علاوہ صرف عورت ہی نہیں مرد بھی کان چھدواتے اور قیمتی پتھروں کے کنگنوں، انگھوٹھیوں، بندوں اور منکوں سے خود کو سجاتے اور سنوارتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کا لباس اپنے طور و اطوار اور تہذیبی رہن سہن کی غمازی کرتا ہے اور اس امر کا متقاضی ہے کہ ہزاروں سال پہلے لوگ لباس اور ہار سنگار سے واقف تھے۔ خود کو خوب صورت رکھنا جانتے تھے۔

مصری درسگائیں:

دنیا کی تہذیبوں کی آثارِ قدیمہ سے بہت کم درس گاہوں کے نقوش ملے ہیں جبکہ ٹیکسلا سے بھی محض یونیورسٹی کے کھنڈرات ہی ملے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قدیم عہد میں مندر اور عبادت گاہوں میں درس و تدریس ہوا کرتی تھی اور وہ بھی عام لوگوں کے لیے نہیں ہوتی تھی خاص لوگوں کے لیے، خاص تعلیمی نظام ہوتا تھا۔ وادی سندھ کی تہذیب میں سنسکرت مذہبی زبان تھی اور مذہبی لوگوں کے لیے رائج تھی۔ اسی طرح مصر

میں بھی وہاں کی عبادت گاہوں میں پرویت اور اس کے خاندان کے لوگوں کے لیے مذہبی تعلیم لازم تھی اور فراعنہ یا بادشاہوں کے لیے تعلیم مخصوص کی گئی تھی۔

چنانچہ فراعنہ کی اولاد کے علاوہ ان کے جرنیلوں کے لیے لکھائی پڑھائی لازمی تھی تاکہ وہ لوگ جنگ کے میدان میں پیغام بھیج سکیں اور وصول کر سکیں۔ حکومتی آفیسروں کو فصل کی پیداوار، مال، مویشیوں کی تعداد اور کسانوں سے ٹیکس وصول کرنے کے لیے بھی اتنا علم لازمی تھا کہ وہ اس کو گن اور پڑھ سکیں۔ نیز کاریگروں کے لیے یہ فن سیکھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ بادشاہوں اور امرا کے مقبروں میں دعائیں اور ان کے کارنامے لکھ سکیں اور پرویتوں کے لیے خاص مذہبی تعلیم انتہائی ضروری تھی کہ یہ لوگ مندروں کی دیواروں پر لکھائی اور اس طرح کے مناظر نقش کر سکیں جن سے ثابت ہو کہ بادشاہ اس عبادت گاہ کی عزت کرتا ہے اور پھر ان کا یہ ایک فریضہ تھا کہ مختلف مناظر کشی کر کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کریں۔ نیز تعلیم یافتہ لوگ دیواروں اور کاغذ پر لکھنے کے ماہر تھے۔

اس زمانے میں لکھنے کے لیے قلم کی بجائے کچھ خاص قسم کے اوزار ہوتے تھے جن سے لکھائی کی بجائے کھدائی کی جاسکے کیونکہ اس زمانے کا رواج حرف کے بجائے پرندوں، جانوروں اور کچھ دوسری علامات کے مفہوم بیان کیے جاتے تھے۔ اس لیے اوزار بھی اس طرح کے ہوتے تھے لیکن باوجود اس کے یہ تعلیم عوام اور غلام کے لیے ممنوع تھی اور نہ ہی یونیورسٹی یا درس گاہ کا تصور ملتا ہے۔ یہ سارا تدریس کا عمل مندروں میں سرانجام دیا جاتا تھا اور کاریگروں کی اولاد ان سے سیکھتی تھی چونکہ پیشہ تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اس لیے شاید کسی یونیورسٹی یا درس گاہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہو گی اور نہ ہی اس کے نقوش ملتے ہیں۔

مصر کی تاریخ کی پہلی یونیورسٹی جامعہ الازہر تھی جو مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ چنانچہ ۹۷۱ء میں اس عظیم درسگاہ کی بنیاد خلیفہ المعز الدین اللہ کے ایک فوجی کمانڈر گوہر السکلی نے رکھی تھی۔ اس درس گاہ کا نام حضرت فاطمۃ الازہرہ کی مناسبت سے رکھی گئی تھی۔ ابتدا میں صرف مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی مسجد دو سال کے اندر تعمیر کی گئی چنانچہ مصر میں فاطمی دور تھا اس لیے وہاں پر اس عقیدے کے مطابق صحن میں تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اس مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ تب اس کا دائرہ کار محض اسلامی تعلیمات تک محدود تھا۔ یہاں حافظہ، فقہ اور قرآن مجید کی تعلیم دی جانے لگی۔ اس درس گاہ میں طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اس کے مضافات میں اساتذہ کی رہائش کے لیے ایک بڑی عمارت تعمیر کی گئی۔

اس طرح فاطمی عہد کے تمام حکمرانوں نے اس درس گاہ پر خصوصی توجہ دی اور اس کی تعمیر اور ترقی کے لیے موثر اقدامات کرتے رہے۔ نیز فاطمی عہد کے خاتمے تک اس درس گاہ میں ہزاروں طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب تخت سنبھالا تو انھوں نے بھی اس ادارے کی ترقی کے لیے اقدامات اٹھائے اور انھوں نے ایک اور چیز کا اضافہ کیا کہ صرف ایک مسلک کے بجائے تمام مسالک شافعی، مالکی، حنفی اور حنبی طرز تعلیم کو بھی رائج کیا جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ صرف شافعی مسلک کے اختیارات میں توسیع کی گئی چنانچہ اب تمام مذہبی علوم، علم الکلام، حدیث اور فقہ اور دیگر علوم کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔

حکمران بدلتے رہے لیکن اس درس گاہ کی ترقی و تعمیر میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس درس گاہ میں طلبا اور طالبات بیک وقت تعلیم حاصل کرنے میں مصروف اور مشغول رہے اور پھر ترکی حکمرانوں نے بھی اس کی توسیع کی۔ نیز اب عہد جدید میں اس کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا ہے اور مصر کے تمام صوبوں میں اس کی شاخیں کھولی گئی ہیں۔ کم و بیش پچپن شعبہ جات یہاں قائم ہو چکے ہیں خوش آئین بات یہ ہے کہ اس یونیورسٹی میں طالبات کے لیے اردو شعبہ بھی سرگرم عمل ہے اور یہ شعبہ گذشتہ نوے سال سے کام کر رہا ہے۔ اس شعبے میں ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی کرائی جاتی ہے۔ الغرض جامعہ الازہر کے بغیر مصر کی تاریخ ادھوری اور نامکمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں طنطا یونیورسٹی بھی درس و تدریس کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔ نیز تمام سفر نامہ نگاروں نے صرف جامعہ الازہر کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ کسی دوسری درس گاہ کا ذکر نہیں کیا اور مصری تہذیب میں کوئی بھی درس گاہ کے آثار نہیں ملے ہیں۔

جمال عبدالناصر کے بعد یہاں درس گاہوں کی تعمیر کا سلسلہ مزید تیز ہوا بلکہ حسنی مبارک کے خلاف جو تحریک چلی تھی اس نے یہاں سرکاری و غیر سرکاری درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کا تانا بانا سا بن گیا ہے جس میں جدید علوم پڑھائے اور سیکھائے جا رہے ہیں جو دراصل ہمارے موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جامعہ الازہر مصر کے علاوہ بھی اسلامی دنیا کی سب سے بڑی درس گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد سعید جاوید، مصریات، بک ہوم لاہور، اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۵۶

۲۔ ایضاً ص ۵۶۔۵۷

۳۔ ایضاً ص ۵۷

۴۔ ایضاً ص ۹۲

۵۔ ایضاً ص ۹۲

۶۔ ایضاً ص ۹۳

۷۔ ایضاً ص ۹۳

۸۔ یعقوب نظامی ، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۸۸

۹۔ ایضاً ص ۸۸

۱۰۔ ایضاً ص ۸۸

۱۱۔ ایضاً ص ۸۸

۱۲۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۷۸

۱۳۔ یعقوب نظامی ، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۶

۱۴۔ ایضاً ص ۱۱۶

۱۵۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۸۸

۱۶۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۹

۱۷۔ ایضاً ص ۱۳۹

۱۸۔ ایضاً ص ۱۶۰

۱۹۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۶۷

۲۰۔ سعید جاوید، محمد، مصریات، بک ہوم لاہور، اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۵۲

۲۱۔ یعقوب، نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۸۲

۲۲۔ ایضاً ص ۸۲

۲۳۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۲۷

۲۴۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۹۳

۲۵۔ ایضاً ص ۹۳۔۹۴

۲۶۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۴۴

۲۷۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۹۸

۲۸۔ ایضاً ص ۹۴

۲۹۔ ایضاً ص ۱۶۹۔۱۷۰

۳۰۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۴۱

۳۱۔ سعید جاوید، محمد، مصریات، بک ہوم لاہور، اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۱

۳۲۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسنِ ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۴۴

۳۳۔ ایضاً ص ۶۶

۳۴۔ محسن مگھیانہ ،ڈاکٹر، حسنِ مصر، سنگری پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۱

۳۵۔ ایضاً ص ۱۲۴

۳۶۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسن ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۶۱

۳۷۔ یعقوب نظامی، مصر کا بازار، مشتاق بک کارنر، اشاعت ۲۰۱۵ء، ص ۹۲

۳۸۔ ایضاً ص ۹۲

۳۹۔ ایضاً ص ۹۲

۴۰۔ الطاف، یوسف زئی، ڈاکٹر، نیل کے سنگ، حسن ادب، فیصل آباد، اشاعت ۲۰۲۲ء، ص ۳۷

۴۱۔ ایضاً ۳۷

ماحصل

انسانی حیات جدوجہد اور کاوش سے عبارت ہے۔ برہنہ، وحشی اور کچا گوشت کھانے والا انسان عہد حاضر میں جن بلندیوں کو چھو رہا ہے اس میں وہ پہلا عمل جس کے دوران اس نے درخت سے پھل اتار کر کھایا اور اس کا مزا چکھا جہاں اسے ارتقا کی پہلی اینٹ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی جدوجہد نے اس کو تہذیب کی بنیاد رکھنے پر اکسایا، فرائڈ نے لکھا ہے کہ انسان نے جب پتھر کے جواب میں گالی دی تبھی سے تہذیب کا آغاز ہوتا ہے یعنی وحشی حیوانِ ناطق کا سفر بھی تہذیب وار ثمرات ہیں۔ انسان نے فطرت کے ہاتھوں خود کو بے بس اور کمزور رکھنے کے بجائے تخلیق اور اختراع کو اولیت دی یہ تخلیق دو طرفہ تھی ایک جانب سے انسان کے وجود میں تبدیلیاں رونما ہوئیں دوسری طرف اس نے معروض میں تبدیلیاں کیں انہی ارتقا اور تغیر نے ہی انسان کو جدید تمدنی اور تہذیبی انسان سے ہم کنار کر دیا تھا۔ انسان کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو اس کی ساری کارستانی ہیں اس کو تاریخ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تاریخ محض واقعات کا نام نہیں ہے۔ ہر چند کہ اس کی اساس واقعات پر ہی مشتمل ہے لیکن ان واقعات کے محرکات بھی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ کے ان محرکات کی نشاندہی ابنِ خلدون نے بہترین طریقے سے کی ہے کہ مورخ ان تمام لوازمات اور محرکات سے بھی بخوبی واقف ہو جس کی وجہ سے معاشرت میں تغیر ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ اور تاریخ نویسی انتہائی وسیع اور دقیق موضوع رہا ہے۔ جس پر فلسفی اور مفکرین نے سیر حاصل مباحث کیے ہیں۔ نیز تاریخ کو محض واقعات نگاری سے فلسفہ سے منسلک کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کئی ایک مفکرین قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے تاریخ کی فلسفیانہ بنیادوں پر تشریح و توجیع پیش کی ہے۔ بعض تاریخ کو حرکی تناظر میں دیکھتے ہیں اور بعض اس کی حرکت ترقی کو اسپرنگ نما حرکت تصور کرتے ہیں اور کچھ مؤرخین نے تاریخ کی ارتقا کو کوپینڈولیم کی صورت میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ بات عیاں ہے کہ تاریخ اور تاریخ نویسی مکمل فلسفہ سے عبارت ہے اور اس کے محرکات خطے مادے اور غیر مادی اصولوں کی عکاسی کرتے ہیں اور مؤرخ ان محرکات کی تہہ تک جانے کی کدوکاوش کرتا ہے۔

یہی جستجو اور کوشش مؤرخ کو معاشرے کی درست تشریح و تفہیم کے لیے اساسی مادفراہم کرتا ہے۔ کیونکہ ایک زمانے تک تاریخ کو محض بادشاہ اور حکمرانوں کی قصیدہ گوئی کے لیے پیش کیا جاتا رہا۔ پھر جوں جوں انسانی فکر اور ذہن نے ترقی کے مراحل طے کیے اور علوم وفنون کے نئے گوشے کھولے تب تاریخ اور فلسفہ تاریخ

میں بھی نئے مباحث کو جگہ ملی اور تاریخ کو بادشاہوں کے دربار سے نکال کر عوام کے بازار اور گلی کوچوں سے متعارف کروایا گیا۔ اب تاریخ کا موضوع اور اس کا فلسفہ بھی عوام کی خواہشات، عقائد، رہن سہن اور طور واطوار کے ساتھ معاشی حالات کے گرد گردش کرنے لگی ہے۔ اس میں کلیدی کردار کارل مارکس کے علاوہ دیگر مفکرین کا بھی ہے۔ چنانچہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ عوام کی حالاتِ زندگی سے عبارت ہے۔

تاریخ کی اہمیت وافادیت ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے اجداد کی میراث کی پاسداری کر رہا ہو۔ اسی طرح اقوام اور افراد بھی تاریخ سے سیکھتے ہیں اور نوع انسانی ذات کی داستان سے آشنائی اور واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انسانی ذہن اور فن کا کمال اس کے تہذیبی اقدار میں پیوست ہے۔ دنیا کی پانچ بڑی تہذیبوں میں مصر کی تہذیب بھی منفرد مقام رکھتی ہے۔ مصر کی تاریخ قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اس خطے پر رومی اور یونانیوں نے بھی حکومت کی تھی لیکن اس کی تاریخ کی اصل پہچان فراعنہ سے ہوتی ہے۔ یہاں کا حکمران یا بادشاہ خود کو فرعون کہلاتا تھا۔ جس کے معنی زمینی خدا ہوتا تھا۔ اس خطے پر کوئی ہزار سال تک فرعونوں کی حاکمیت رہی۔ ہر چند یہاں کی تہذیبی اساس دریائے نیل کے مرہون منت ہے لیکن دنیا کے سات عجائبات میں اہرام بھی عجوبہ تصور ہوتا ہے۔ نیز اس خطے میں ممیاں حنوط کردہ لاشیں، کاغذ کی ایجاد، سونا اور دیگر معاشی وسماجی سرگرمیوں کا مرکز ملتا ہے۔ فرعون کے بعد رومی اور یونانی بھی آئے بعدازاں مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ ہنوز مسلمان حاکم ہیں۔

یہ خطہ چونکہ دریائے نیل کے کنارے پر آباد تھا اس لیے زراعت اور پیداوار میں ترقی ہوئی اور اسی کے ساتھ یہاں تہذیب کے آثار نمودار ہوئے۔ یہاں کی تہذیب وتمدن دنیا کی دوسری تہذیبوں سے مماثلت اور انفرادیت بھی رکھتی ہے۔ اس تہذیب نے شہر کی بنیاد رکھی اور زراعت کو ترقی دی۔ چونکہ یہ بادشاہی عہد میں سانس لے رہی تھی اس لیے یہاں طبقات بھی قائم تھے اور غلام بھی تھے۔ خود حضرت یوسف کو یہاں فروخت کیا گیا تھا۔ اس تہذیب کی ایک پہچان انبیا کی سرزمین کی نسبت سے بھی ہے اسی مصر میں بنی اسرائیل، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی تاریخ بھی ملتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ان سارے واقعات کو سفر نامہ نگاروں کی روشنی میں پرکھنے کی سعی کی ہے۔

ادب کی جامع تعریف زندگی کی طرح ناممکن ہے۔ مفکرین اور فلسفیوں نے اس کی بے تحاشہ تعریفیں کیں ہیں لیکن یوں لگتا ہے کہ ابھی مزید تشریح کی ضرورت ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے مرنے والا شخص یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ ابھی چند سانسیں اور جینی چاہئیں، ادب کی مکمل وار جامع تعریف ہنوز تشنہ ہے۔ کیونکہ انسان کی

ذہنی صلاحتیں دن بہ دن نئے مظہر سے عیاں ہو رہی ہیں۔ نیز ادب میں جہاں دیگر اصناف ہیں اس میں سفر نامہ بھی ایک صنف ہے۔ ہر چند کہ اس کا ماحول سیر و سیاحت جو مکمل خارجی پہلو ہے لیکن اس کا داخلی پہلو سفر نامہ نگار کے جذبات اور محسوسات کے گرد گھومتا ہے کہ وہ قاری کو اپنے ہمراہ کس طرح سفر پر ساتھ لے جاتا ہے اور اپنی آنکھ سے وہ مقام اور جگہ سے لطف اندوز کرتا ہے۔

اردو میں پہلا سفر نامہ عجائبات فرنگ ہے اور ازاں بلاد یورپ اور حج کے سفر نامے مشہور ہیں جن میں سر سید احمد خان اور شبلی نعمانی کے سفر ناموں نے علمی درجہ حاصل کیا۔ چنانچہ ہمارے بنیادی مآخذ سفر نامے ہیں جن کی روشنی میں مصری تہذیب کو سمجھنے اور پرکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان سفر ناموں میں یعقوب نظامی کا "مصر کا بازار" بھی شامل ہے۔ یہ سفر نامے آغاز سے آخر تک مصری تہذیب کے گرد گھومتی رہی ہے اور اس کا طرز تحریر سفر نامہ نگار سے زیادہ مؤرخ کا انداز لگتا ہے۔ انھوں نے عہد فراعنہ کی تمام پہلوؤں کو احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ محمد سعید جاوید کا سفر نامہ "مصریات" بھی اسلوب اور طرزِ تحریر میں انفرادیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اول الذکر سفر نامے کی طرح تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے، ڈاکٹر محسن میگھانہ کا سفر نامہ "حسنِ مصر" اختصار میں اپنی مثال رکھتا ہے اور یہ سفر نامہ انھوں نے مصر میں میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے دوران لکھا۔ انھوں نے طوالت اور جامیعت کے بجائے اختصار کو اولیت دی اسی وجہ سے سفر نامے کے بجائے مضمون کا تاثر دیتا ہے۔ ایک اور سفر نامہ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے "نیل کے سنگ" کے عنوان سے لکھا۔ اس سفر نامے میں تہذیب و تمدن کو جزئیات کے بجائے مفصل اور دانائی سے سر شار ہے۔ اس سفر نامے میں وہ گائیڈ اور مصری میزبان کے ساتھ گفتگو کے دوران تہذیبی گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے تاریخی حوالے بھی دیتے ہیں۔ ان کی نثر میں ادبیت کا عنصر غالب ہے۔ ہر چند کہ سفر نامہ مختصر ہے۔

سفر ناموں کی آخری کڑی محمد رفیق ڈوگر کا سفر نامہ "اور نیل بہتا رہا" شامل ہے۔ اس سفر نامے کا عنوان اپنے اندر تجسس اور جاذبیت رکھتا ہے لیکن مصر کے حوالے سے اتنی ہی اجنبیت بھی رکھتا ہے۔ سب سے مختصر سفر نامہ مصر کے تناظر میں ہے اور اس میں بھی ان کی داخلی اور فرویبی باتوں میں کثرت پائی جاتی ہے۔ لہذا ان سفر ناموں کی بنیاد بنا کر مصری تہذیب و تمدن کو سمجھنے کی جسارت کی گئی ہے۔ جبکہ تہذیب اور اس کے اساس خالصتاً سماجیات، عمرانیات اور علم بشریات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ سفر ناموں نے تاریخ اور تہذیب کو

ایک خطے کے لوگوں کو دوسرے خطے کے لوگوں سے روشناس کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے سفر ناموں کو مآخذ رکھا ہے۔

ان سفر ناموں کو صراحت سے پیش کیا گیا ہے اور جہاں سفر نامہ نگار کو مناسب لگا اس نے تاریخ کے حوالے اور اسباب کو رقم کیا ہے۔ مصر کی سرزمین انبیاء کی سرزمین بھی کہلاتی ہے اسی سرزمین پر حضرت یوسف علیہ السلام فروخت ہوئے، قید کاٹی اور پھر فرعون کے وزیر بھی بنے۔ مصر میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے۔ فرعون اپنی پوری کوشش کے باوجود حکم الٰہی کو مسترد نہیں کر سکے بلکہ فرعون ہی کے گھر میں پرورش پائی۔ دعوت حق بھی دی۔ بنی اسرائیل کو خدا کی وحدانیت کی جانب راغب کرتے رہے۔ کوہ طور بھی مصر کی وادی میں قائم ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو سفر نامہ نگاروں نے جزئیات کے ساتھ پیش کیا اور قرآن مجید کے حوالے بھی دیتے رہے۔ مصر کی تہذیب پر فراعنہ عقائد کا غلبہ رہا ہے۔ جس کو بہترین انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ اس عہد میں دیوتاؤں کی پوجا اور عبادت کے طریقے قاری کو بتائے سمجھائے گئے ہیں۔

مصر میں تاریخی مزارات کی ایک طویل اور لمبی فہرست ہے جس میں فراعین تو شامل ہیں لیکن اسلامی حکومت کے بعد دیگر مسلمانوں کے مزارات بھی ہیں جن میں امام شافعی، حضرت زینب، حضرت سکینہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک بھی شامل ہے۔ سفر نامہ نگاروں نے تاریخی حوالہ جات سے ان مباحث کو بھی سمیٹا ہے اور مزارات کی تصویر کشی بھی پیش کی ہے۔ چنانچہ فاطمی عہد کی سب سے بڑی مسجد اور درس گاہ جامعہ الازہر کا ذکر ہر سفر نامہ نگار کے یہاں بڑی عقیدت سے ملتا ہے۔ انھوں نے یہاں خود دیکھا اور قلبی سکون محسوس کیا۔ اس کو اسی انداز میں پیش بھی کیا ہے۔

مصری تہذیب کے لیے دریائے نیل بہت بڑی نعمت ہے۔ دریائے نیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بھی منسوب ہے اور حضرت عمر فاروق کا خطہ بھی منسوب ہے۔ اس واقعے کو تاریخی شواہد کی روشنی میں قلمبند کیا گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضہ کے خطہ سے قبل دریائے نیل میں خوب صورت اور جوان کنواری لڑکی کو قربان کیا جاتا تھا تاکہ دریائے نیل اپنی طغیانی اور تلاطم کو برقرار رکھے۔ مصر کا عجائب گھر دراصل عبرت گاہ ہے جہاں سے انسان عبرت ہی حاصل کر سکتا ہے۔ نیز عجائب گھر میں فراعنہ عہد کی ممیاں، حنوط شدہ لاشیں اور مقبروں سے دریافت شدہ زیورات، نوادرات اور دیگر قیمتی سامان رکھے ہوئے ہیں۔ جو فراعین کے ساتھ قبر میں دفن کیے جاتے تھے اور اس کے علاوہ فراعنہ ملکاؤں کے مجسمے بھی نصب ہیں۔ ہر سفر نامہ نگار نے اپنے اپنے ذوق طبع کے مطابق ان کے تاثرات کو قلمبند کیا ہے۔ مصر کی قدیم تاریخ میں مندروں میں عبادت کی جاتی تھی

ان میں کرناک کا مندر اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ چنانچہ مندروں اور دیگر عبادت گاہوں کو بھی قاری پڑھ کر مصری تہذیب اور تاریخ سے روشناس ہوتا ہے۔ مصر کے تاریخی شہر کا تعارف اور تاریخ بھی قابل ذکر ہے اور اس کے علاوہ یہاں کا چڑیا گھر، اسکندریہ کا مقام، محمد شاہ آغا خان کا مقبرہ، ہاتھیوں کا جزیرہ بھی مشہور مقامات میں شامل ہیں۔ جن کا ذکر اور تذکرہ سفر نامہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

مصری تہذیب اپنے جوہر میں ہمہ جہت گوشے رکھتی ہے۔ جہاں علوم و فنون میں فنونِ لطیفہ کو بڑی ترقی ملی تھی۔ ہر چند کہ یہاں کے لوگ مہمان نواز بھی رہے ہیں اور مہمان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کا تذکرہ صرف محمد سعید جاوید نے کیا ہے۔ مصر دنیا کا وہ واحد خطہ ہے جہاں مصنوعی طور پر حنوط کیا جاتا تھا۔ حنوط سے مراد یہ ہے کہ کسی لاش کو ممی کی صورت میں تبدیل کر دینا چونکہ مصر کے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر سے زندہ کیا جائے گا اور روح کو جسم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے جسم کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔ نیز یعقوب نظامی اور محمد سعید جاوید نے حنوط پر تفصیل سے لکھا اور مصری ممیاں کیسے تیار کی جاتی تھیں ان پر بھی علمی مباحث کو پیش کیا گیا اور حنوط کے جتنے طریقے تھے ان کو بھی قلمبند کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس مقالے میں مصری تعمیرات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مصر کی دنیا بھر میں پہچان اہرام کی وجہ سے ہے جس دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایک شاندار مساجد مصر کی تاریخ کا آئینہ دار ہیں۔ جن میں اسے ہر ایک کا تذکرہ مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ فراعنہ مذہبی طور پر دیوتاؤں کی عبادت کرتے تھے ان میں سے ازریس، ازبیس، ہورس اور سورج کا دیوتا رااِیمن اور دیگر ان گنت دیوی اور دیوتا ہیں جن کی عبادت اور پوجا کی جاتی تھی اس پہلو کو تفصیل سے پیش کیا گیا اور مصری تہذیب کا اہم جزر ہن سہن تھا۔

اس مقالے میں سفر ناموں کی روشنی میں طرزِ معاشرت، رہن سہن، شادی بیاہ، مرد و عورت کا مقام اور ان کی سماجی اور معاشی تعلقات کو بھی تحقیق اور تجزیئے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کا اس عہد میں لباس ہار سنگار اور طور و اطوار کی نوعیت کون سی تھی، زرعی معاشرت میں عورت کو کونسا مقام دیا گیا تھا چنانچہ مصری تہذیب کی یہ خوبی تھی کہ اس نے عورت کو اعلیٰ درجہ دیا ہوا تھا اور لباس میں بھی انفرادیت رکھتی تھی۔ ہر چند کہ سونے کے زیورات سے خود کو آراستہ کرتی تھی اور یہ مرد و عورت دونوں میں پہننے کا رواج تھا۔ جہاں مصری تہذیب میں عورت کی آزادی مقدم تھی وہیں پر مصری حسن بھی تاریخ کا لازوال پہلو رہی ہے۔ سفر ناموں میں مصری حسن کا جو تذکرہ ملتا ہے وہ مصری عورت کو جاذبیت، دل کشی اور عشوہ و غمزے کی عکاسی

کرتی ہے۔ چنانچہ ان سفر ناموں میں مصر کی صرف جامعہ الازہر درس گاہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی تاریخ اور صداقت کو مقالے میں احسن طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی خاصیت ہے کہ سفر ناموں کی مدد سے مصری تاریخ اور تہذیب کے گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو اپنی نوعیت میں دقیق اور مشکل کام تھا لیکن اس کو سر کر لیا گیا ہے۔

تحقیقی سوالات:

۱۔ اردو سفر ناموں میں مصری تاریخ کی تخصیص کیا ہے؟

جواب:

اردو سفر نامے اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے انفرادیت کے حامل رہے ہیں جس میں بلادِ یورپ اور حج کے سفر نامے قابل ذکر رہے ہیں۔ لیکن اردو سفر نامہ نگاروں نے مصر کی سیر و سیاحت کے بعد وہاں کی تہذیب اور تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے یعقوب نظامی اور محمد سعید جاوید کے سفر نامے انفرادیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے مصر کے فراعنہ عہد کی تاریخ کے بنیادی گوشوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ جس میں فرعون رعمیس ثانی کے واقعات اور حالات قابل ذکر ہیں ہر چند کہ سفر نامے کا مکمل تاریخ سے تعلق نہیں ہوتا لیکن انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا۔

جہاں تاریخ کی کتابوں کے حوالوں کی ضرورت محسوس کی وہ بھی پیش کیے اور قرآن مجید کی آیات کی مدد سے بھی رعمیس ثانی اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کو احسن طریقے سے بیان کیا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سفر نامے اگر مکمل تاریخ نہیں بھی ہیں تو تاریخ کا حصہ یا جز ضرور ہیں اور یہی حصہ یا جزو اردو سفر ناموں میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ملکہ قلوپطرہ کی تاریخ، ملکہ نفرتینی کی تاریخ بھی ان سفر ناموں کی زینت بنی ہیں اور قاری کو نصف تاریخ سے ضرور آگاہی ملتی ہے۔

۲۔ مصری تہذیب نے اردو سفر نامے پر کیا کیا اثرات مرتب کیے:

جواب:

مصر اپنے عہد کی اعلیٰ تہذیب کی مالک رہی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اس کی شناخت اور تذکرہ محض فرعونیت کے تناظر میں ہوتا رہا ہے اور اس کے یہی اثرات اردو سفر ناموں میں بھی عیاں ہوتے ہیں۔ سفر ناموں کی ہر عبارت

میں تہذیب کے روشن پہلوؤں سے کئی زیادہ عبرت کدہ ہمارے لیے عبرت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ہر چند کہ یہ عہد جدید تہذیب اور تمدن کا متقاضی ہے۔ لیکن عہد گزشتہ کو فراموش کرنا یا نظر انداز کرنا غیور اقوام کے لیے مناسب نہیں اور اس کے علاوہ اسلامی عہد کے فتوحات، مساجد اور درس گاہ مشاہیر السلام کی یاد تازہ کر دیتی ہیں چنانچہ اردو سفر ناموں کے موضوع کو وسعت ملتی ہے اور نئے گوشے استوار ہوتے ہیں وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، چال چلن بھی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

نتائج:

۱۔ اردو سفر نامہ نگاروں نے مصری تاریخ و تہذیب کی جزئیات کو احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔

۲۔ اردو سفر نامے محض سیر و سیاحت کا احوال نہیں بتاتے بلکہ تاریخ و تہذیب سے بھی روشناس کرواتے ہیں۔

۳۔ اردو سفر نامے کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ہے لیکن اسلوب بیان اور موضوع کو پیش کرنے کے حوالے سے دنیا کے عالمی سفر ناموں کے ساتھ کھڑی ہے۔

۴۔ فراعنہ عہد اور وہاں کی تہذیب اپنے خاص ماحول کی پیداوار تھی جو بدلتے حالات کے ساتھ ارتقا نہیں کر سکتے اس لیے قصہ پارینہ بن چکی ہے۔

۵۔ سیاح کی نگاہ اگر تاریخ شناس ہے تو وہ تہذیب کی ترقی اور اس کے انحطاط و زوال کو قلمبند کر سکتا ہے جس طرح ان سفر ناموں میں کیا گیا ہے۔

سفارشات:

۱۔ اردو سفر ناموں کی فکری، فنی اور ہئیتی پہلوؤں کو مزید اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مصری تہذیب اور وادی سندھ کی تہذیب کا تقابلی مطالعہ اور تجزیے کا گوشہ تحقیق طلب ہے۔

۳۔ مصری تہذیب و تمدن پر اسلامی تہذیب کے اثرات پر نئے سرے سے تحقیق ہونی چاہیے۔

۴۔ سفر ناموں کا اسلوبیاتی مطالعے کے پہلو کو اجاگر کرنا چاہیئے۔

کتابیات:(Bibliography)

بنیادی ماخذ:

الطاف یوسف زئی،ڈاکٹر،نیل کے سنگ،حسن ادب، فیصل آباد،۲۰۲۲ء

محسن مگھیانہ،ڈاکٹر،حُسنِ مصر،سنگری،فیصل آباد،۲۰۱۸ء

محمد رفیق ڈوگر،اور نیل بہتا رہا،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶ء

محمد سعید جاوید، مصریات، بک ہوم،لاہور،۲۰۱۶ء

یعقوب نظامی،مصر کا بازار،نگارشات پبلشرز،لاہور،۲۰۱۵ء

ثانوی ماخذ:

ادیب،مرزا،سفر نامہ اور تخلیقی فن،اوراق،لاہور،سن،۱۹۷۸ء

انوار ہاشمی، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس کراچی، سن،۱۹۹۵ء

افتخار حسین،آغا،قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، مجلس ترقی ادب،لاہور،سن ۲۰۱۴ء

ساجد امجد،ڈاکٹر،اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات،الوقار پبلی کیشنزلاہور،سن، ۲۰۰۳ء

سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیا، کراچی، سن ۱۹۸۹ء

سبط حسن،سید،ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال کراچی، سن،۱۹۸۴ء

سید احمد خان، سر، مسافرانِ لندن، مرتب، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب،لاہور، سن،ندارد

شبلی نعمانی، سفر نامہ، روم، و مصر شام، مطبع جنت دہلی، سن،۱۳۳۵ھ

عبداللہ سید، ڈاکٹر،اشاراتِ تنقید، مطبوعہ جمال پریس دہلی، سن،ندارد

عبداللہ سید،ڈاکٹر، سرزمین حافظ و قیام،از مقبول درخشانی، پیش لفظ، سن،ندارد

علی عباس جلالپوری، مقالات جلالپوری، تخلیقات لاہور، سن ۲۰۱۳ء

محمد فرقان سنبھلی،انجنیر، مصرِ قدیم،اسلامی کتاب گھر، دہلی، سنِ،۲۰۰۳ء

مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ اور فلسفہ تاریخ، فکشن ہاؤس لاہور، سن ۱۹۹۳ء

مجنوں، گورکھپوری، شعر اور غزل،ادبی اکیڈمی، دہلی کالونی، کراچی، سن،ندارد

محمد حنیف ندوی، مولانا، افکار ابن خلدون، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، سن، ۱۹۹۵ء
محمد حیات نصرت، ڈاکٹر، عربی ثقافت کے سماجی پہلو، نظامی پریس لکھنو، ہندوستان، سن، ۱۹۹۸ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، مکتبہ عزد بان، سرگودھا، سن، ۱۹۹۸ء
یوسف، کمبل پوش، خان، عجائبات فرنگ، نول کشور پریس لکھنو، سن ۱۸۹۸ء
مصر کی قدیم تاریخ، دی سائنٹیفک سوسائٹی، عالمگیر شاہ وارثی، شہر، سن، ۱۸۲۶۴ء

English Books

Andrew Bednarski, A History of World Egyptology,
Cambridge University Press, 2021
Encyclopedia of Britannica USA th Addition, 1982